سُوۡرَةُ الصّٰٓفّٰت 37 مَکِّیَّة 56 رکوعات 5

آیات 182

نام

پہلی ہی آیت کے لفظ والصافات سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول

مضامین اور طرز کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ سورت غالباً مکی دور کے وسط میں، بلکہ شاید اس دور متوسط کے بھی آخری زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔ انداز بیان صاف بتارہا ہے کہ پس منظر میں مخالفت پوری شدت کے ساتھ برپا ہے اور نبی و اصحاب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نہایت دل شکن حالات سے سابقہ در پیش ہے۔

موضوع و مضمون

اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)کی دعوت توحید و آخرت کا جواب جس تمسخر اور استہزاء کے ساتھ دیا جا رہا تھا اور آپ کے دعوائے رسالت کو تسلیم کرنے سے جس شدت کے ساتھ انکار کیا جا رہا تھا، اس پر کفار مکہ کو نہایت پر زور طریقہ سے تنبیہ کی گئی ہے اور آخر میں انہیں صاف صاف خبردار کردیا گیا ہے کہ عنقریب یہی پیغمبر، جس کا تم مذاق اڑا رہے ہو، تمہارے دیکھتے دیکھتے تم پر غالب آجائے گا اور تم اللہ کے لشکر کو خود اپنے گھر کے صحن میں اترا ہوا پاؤ گے (آیت نمبر 171 تا 179)۔ یہ نوٹس اس زمانہ میں دیا گیا تھا جب نبی ﷺ کی کامیابی کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ مسلمان (جن کو ان آیات میں اللہ کا لشکر کہا گیا ہے) بری طرح ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان کی تین چوتھائی تعداد ملک چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ نبی ﷺ کے ساتھ بمشکل 40 ۔ 50 صحابہ مکہ میں رہ گئے تھا اور انتہائی بےبسی کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے۔ ان حالات میں ظاہر اسباب کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہ کرسکتا تھا کہ غلبہ آخر کار محمد ﷺ اور آپ کی مٹھی بھر بےسرو سامان جماعت کو نصیب ہوگا۔ بلکہ دیکھنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک مکہ کی گھاٹیوں ہی میں دفن ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن 15 ۔ 16 سال سے زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آگیا جس سے کفار کو خبردار کیا گیا تھا۔

تنبیہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس سورة میں تفہیم اور ترغیب کا حق بھی پورے توازن کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ توحید اور آخرت کے عقیدے کی صحت پر منحصر دل نشین دلائل دیے ہیں، مشرکین کے عقائد پر تنقید کر کے بتایا ہے کہ وہ کیسی لغو باتوں پر ایمان لائے بیٹھے ہیں، ان گمراہیوں کے برے نتائج سے آگاہ کیا

ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان و عمل صالح کے نتائج کس قدر شاندار ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں پچھلی تاریخ کی مثالیں دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاء کے ساتھ اور ان کی قوموں کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے، کس کس طرح اس نے اپنے وفادار بندوں کو نوازا ہے اور کس طرح ان کے جھٹلانے والوں کو سزا دی ہے۔

جو تاریخی قصے اس سورۃ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ سبق آموز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ کا یہ اہم واقعہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ پاتے ہی اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ اس میں صرف ان کفار قریش ہی کے لیے سبق نہ تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اپنے نسبی تعلق پر فخر کرتے پھرتے تھے، بلکہ ان مسلمانوں کے لیے بھی سبق تھا جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے تھے۔ یہ واقعہ سنا کر انہیں بتادیا گیا کہ اسلام کی حقیقت اور اس کی اصلی روح کیا ہے اور اسے اپنا دین بنا لینے کے بعد ایک مومن صادق کو کس طرح اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کردینے کے لیے تیار ہوجانا چاہیے۔

سورۃ کی آخری آیات محض کفار کے لیے تنبیہ ہی نہ تھیں بلکہ ان اہل ایمان کے لیے بشارت بھی تھیں جو نبی ﷺ کی تائید و حمایت میں انتہائی حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہیں یہ آیات سنا کر خوشخبری دے دی گئی کہ آغاز کار میں جن مصائب سے انہیں سابقہ پیش آ رہا ہے ان پر گھبرائیں نہیں، آخر کار غلبہ ان ہی کو نصیب ہوگا اور باطل کے وہ علمبردار جو اس وقت غالب نظر آ رہے ہیں، انہی کے ہاتھوں مغلوب و مفتوح ہو کر رہیں گے۔ چند ہی سال بعد واقعات نے بتادیا کہ یہ محض خالی تسلی نہ تھی بلکہ ایک ہونے والا واقعہ تھا جس کی پیشگی خبر دے کر ان کے دل مضبوط کیے گئے تھے۔

سُوْرَۃُ الصّٰٓفّٰت

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۱ۙ

قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم،

فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۲ۙ

پھر ان کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں،

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۳ۙ

پھر ان کی قسم جو کلام سنانے والے [۱] ہیں ،

(۱) ۔ مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ان تینوں گروہوں سے مراد فرشتوں کے گروہ ہیں اور یہی تفسیر حضرات عبداللہ بن مسعود رضی اللہ

، ابن عباس رضی اللہ ، قَتَادہ رضی اللہ ، مسروق رضی اللہ ، سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، سدی، ابن زید اور ربیع بن انس سے منقول ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی دوسری تفسیریں بھی کی ہیں، مگر موقع و محل سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔

اس میں " قطار در قطار صف باندھنے " کا اشارہ اس طرف ہے کہ تمام فرشتے جو نظام کائنات کی تدبیر کر رہے ہیں، اللہ کے بندے اور غلام ہیں، اس کی اطاعت و بندگی میں صف بستہ ہیں اور اس کے فرامین کی تعمیل کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔ اس مضمون کا اعادہ آگے چل کر پھر آیت 165 میں کیا گیا ہے جس میں فرشتے خود اپنے متعلق کہتے ہیں وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ۔

" ڈانٹنے اور پھٹکارنے " سے مراد بعض مفسرین کی رائے میں یہ ہے کہ کچھ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ہانکتے اور بارش کا انتظام کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ مفہوم بھی غلط نہیں ہے، لیکن آگے کے مضمون سے جو مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ انہی فرشتوں میں سے ایک گروہ وہ بھی ہے جو نافرمانوں اور مجرموں کو پھٹکارتا ہے اور اس کی یہ پھٹکار صرف لفظی ہی نہیں ہوتی بلکہ انسانوں پر وہ حوادث طبیعی اور آفات تاریخی کی شکل میں برستی ہے۔

" کلام نصیحت سنانے " سے مراد یہ ہے کہ انہی فرشتوں میں وہ بھی ہیں جو امر حق کی طرف توجہ دلانے کے لیے تذکیر کی خدمت انجام دیتے ہیں، حوادث زمانہ کی شکل میں بھی جن سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کرتے ہیں اور ان تعلیمات کی صورت میں بھی جو ان کے ذریعہ سے انبیاء پر نازل ہوتی ہیں اور ان الہامات کی صورت میں بھی جو ان کے واسطے سے نیک انسانوں پر ہوتے ہیں۔

اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۴ۙ

تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے (۲)

(۲) یہ وہ حقیقت ہے جس پر مذکورہ صفات کے حامل فرشتوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ پورا نظام کائنات جو اللہ کی بندگی میں چل رہا ہے اور اس کائنات کے وہ سارے مظاہر جو اللہ کی بندگی سے انحراف کرنے کے برے نتائج انسانوں کے سامنے لاتے ہیں اور اس کائنات کے اندر یہ انتظام کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک پے در پے ایک ہی حقیقت کی یاد دہانی مختلف طریقوں سے کرائی جا رہی ہے، یہ سب چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ انسانوں کا " اِلٰہ " صرف ایک ہی ہے۔

" اِلٰہ " کے لفظ کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔ ایک وہ معبود جس کی بالفعل بندگی و عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرے وہ معبود جو فی الحقیقت اس کا

مستحق ہو کہ اس کی بندگی و عبادت کی جائے۔ یہاں اِلٰہ کا لفظ دوسرے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے معنی میں تو انسانوں نے دوسرے بہت سے اِلٰہ بنا رکھے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے " اِلٰہ " کا ترجمہ " معبود حقیقی " کیا ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا وَ رَبُّ الۡمَشَارِقِ ؕ﴿۵﴾

وہ جو زمین اور آسمانوں کا اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں اور سارے مشرقوں (۳) کا مالک (۴) ۔

(۳) ۔ سورج ہمیشہ ایک ہی مطلع سے نہیں نکلتا بلکہ ہر روز ایک نئے زاویے سے طلوع ہوتا ہے۔ نیز ساری زمین پر وہ بیک وقت طلوع نہیں ہوجاتا بلکہ زمین کے مختلف حصوں پر مختلف اوقات میں اس کا طلوع ہوا کرتا ہے۔ ان وجوہ سے مشرق کے بجائے مشارق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ مغارب کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ مشارق کا لفظ خود ہی مغارب پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم ایک جگہ رَبُّ المَشَارق و المغارب کے الفاظ بھی آئے ہیں (المعارج، 40)۔

(۴) ۔ ان آیات میں جو حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا مالک و فرمانروا ہی انسانوں کا اصل معبود ہے اور وہی درحقیقت معبود ہوسکتا ہے اور اسی کو معبود ہونا چاہیے۔ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ رب (یعنی مالک اور حاکم اور مربی و پروردگار) کوئی ہو اور اِلٰہ (عبادت کا مستحق) کوئی اور ہوجائے۔ عبادت کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ آدمی کا نفع و ضرر، اس کی حاجتوں اور ضرورتوں کا پورا ہونا، اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا، بلکہ بجائے خود اس کا وجود و بقا ہی جس کے اختیار میں ہے، اس کی بالا تری تسلیم کرنا اور اس کے آگے جھکنا آدمی کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ اس وجہ کو آدمی سمجھ لے تو خود بخود اس کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ اختیارات والے کی عبادت کرنا، دونوں صریح خلاف عقل و فطرت ہیں۔ عبادت کا استحقاق پہنچتا ہی اس کو ہے جو اقتدار رکھتا ہے۔ رہیں بے اقتدار ہستیاں تو وہ نہ اس کی مستحق ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے اور نہ ان کی عبادت کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے کا کچھ حاصل ہے، کیونکہ ہماری کسی درخواست پر کوئی کارروائی کرنا سرے سے ان کے اختیار میں ہے ہی نہیں۔ ان کے آگے عاجزی و نیاز مندی کے ساتھ جھکنا اور ان سے دعا مانگنا بالکل ویسا ہی احمقانہ فعل ہے جیسے کوئی شخص کسی حاکم کے سامنے جائے اور اس کے حضور درخواست پیش کرنے کے بجائے جو دوسرے سائلین وہاں درخواستیں لیے کھڑے ہوں ان ہی میں سے کسی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوجائے۔

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِزِیۡنَۃِ ۣ الۡکَوَاکِبِ ۙ﴿۶﴾

ہم نے آسمان (۵) دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے

(۵) ۔ آسمان دنیا سے مراد قریب کا آسمان ہے، جس کا مشاہدہ کسی دوربین کی مدد کے بغیر ہم برہنہ آنکھ سے کرتے ہیں۔ اس کے آگے جو عالم

مختلف طاقتوں کی دوربینوں سے نظر آتے ہیں اور جن عالموں تک ابھی ہمارے وسائل مشاہدہ کی رسائی نہیں ہوئی ہے، وہ سب دور کے آسمان ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ " سماء " کسی متعین چیز کا نام نہیں ہے بلکہ قدیم ترین زمانے سے آج تک انسان بالعموم یہ لفظ عالَمِ بالا کے لیے استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔

وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ۝۷

اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کردیا ہے ۔(٦)

(٦) ۔ یعنی عالم بالا محض خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے، بلکہ اس کی بندش ایسی مضبوط ہے اور اس کے مختلف خطے ایسی مستحکم سرحدوں سے محصور کیے گئے ہیں کہ کسی شیطان سرکش کا ان حدوں سے گزر جانا ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے ہر تارے اور ہر سیارے کا اپنا ایک دائرہ اور کرہ (Sphere) ہے جس کے اندر سے کسی کا نکلنا بھی سخت دشوار ہے اور جس میں باہر سے کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھے تو خلائے محض کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ہے لیکن حقیقت میں اس خلا کے اندر بےحد و حساب خطے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کیے گئے ہیں جن کے مقابلے میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان گو ناں گوں مشکلات سے کیا جاسکتا ہے جو زمین کے رہنے والے انسان کو اپنے قریب ترین ہمسائے، چاند تک پہنچنے میں پیش آ رہی ہیں۔ ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق، یعنی جنوں کے لیے بھی عالم بالا کی طرف صعود کرنے میں مانع ہیں۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ٭ ۸

یہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں سن سکتے، ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں۔

دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ۝۹

اور ان کے لیے پیہم عذاب ہے۔

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ۝۱۰

تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے ۔(٧)

(٧) ۔ اس مضمون کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اس وقت عرب میں کہانت کا بڑا چرچا تھا۔ جگہ جگہ کاہن بیٹھے پیشن گوئیاں کر رہے تھا، غیب کی خبریں دے رہے تھے، گم شدہ چیزوں کے پتے بتا رہے تھے اور لوگ اپنے اگلے پچھلے حال دریافت کرنے کے لیے ان سے رجوع کر رہے تھے۔ ان کاہنوں کا دعویٰ یہ تھا کہ جن اور شیاطین ان کے قبضے میں ہیں اور وہ انہیں ہر طرح کی خبریں لا لا کردیتے ہیں۔ اس ماحول میں جب رسول اللہ ﷺ منصب نبوت پر سرفراز ہوئے اور آپ نے قرآن مجید کی آیات سنانی شروع کیں جن میں پچھلی تاریخ اور آئندہ پیش آنے والے حالات کی خبریں دی گئی تھیں اور ساتھ ساتھ آپ نے یہ بھی بتایا کہ ایک فرشتہ یہ آیات میرے پاس لاتا ہے، تو آپ کے مخالفین نے فوراً آپ کے اوپر کاہن کی پھبتی کس دی اور لوگوں سے کہنا شروع

کردیا کہ ان کا تعلق بھی دوسرے کاہنوں کی طرح کسی شیطان سے ہے جو عالم بالا سے کچھ سن گن لے کر ان کے پاس آجاتا ہے اور یہ اسے وحی الٰہی بنا کر پیش کردیتے ہیں۔ اس الزام کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ارشاد فرما رہا ہے کہ شیاطین کی تو رسائی ہی عالم بالا تک نہیں ہو سکتی۔ وہ اس پر قادر نہیں ہیں کہ ملاء اعلیٰ (یعنی گروہ ملائکہ) کی باتیں سن سکیں اور لا کر کسی کو خبریں دے سکیں۔ اور اگر اتفاقاً کوئی ذرا سی بھنک کسی شیطان کے کان میں پڑجاتی ہے تو قبل اس کے کہ وہ اسے لے کر نیچے آئے، ایک تیز شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے ذریعہ سے کائنات کا جو عظیم الشان نظام چل رہا ہے وہ شیاطین کی دراندازی سے پوری طرح محفوظ ہے۔ اس میں دخل دینا تو درکنار، اس کی معلومات حاصل کرنا بھی ان کے بس میں نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، سورۂ الحجر، حواشی 8 تا 12)

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾

اب ان سے پوچھو، ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟ (۸) ان کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔ (۹)

(۸) یہ کفار مکہ کے اس شبہ کا جواب ہے جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوئے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے جواب میں امکان آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے ان کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک مرے ہوئے انسانوں کو دو بارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمہارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان اور یہ بیشمار اشیاء جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، ان کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے ؟ آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جو خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کرچکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے۔

(۹) یعنی یہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے۔ مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اسی مٹی سے بنایا جاسکتا ہے۔

لیس دار گارے سے انسان کی پیدائش کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اول کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی اور پھر آگے نسل انسانی اسی پہلے انسان کے نطفہ سے وجود میں آئی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر انسان لیس دار گارے سے بنا ہے۔ اس لیے کہ انسان کا سارا مادہ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفہ سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا ہی سے بنتا ہے اور استقرار حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزاء سے مرکب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخر کار اس کا ماخذ وہ مٹی

ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلے اور ترکاریاں اور پھل نکالے اور ان حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔

پس بنائے استدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو ؟ اگر اس میں زندگی پیدا کیے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمہارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اسی مٹی سے تمہاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہوگی ؟

بَلْ عَجِبْتَ وَ يَسْخَرُوْنَ ۝۱۲

تم (اللہ کی قدرت کے کرشموں پر) حیران ہو اور یہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں

وَ اِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۝۱۳

سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے

وَ اِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝۱۴

کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں

وَ قَالُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۵

اور کہتے ہیں ‘‘ یہ تو صریح جادو [۱۰] ہے ،

(۱۰) یعنی عالم طلسمات کی باتیں ہیں، کوئی جادو کی دنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے، جس میں مردے اٹھیں گے، عدالت ہوگی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہوں گے۔ یا پھر یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اس پر جادو کردیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝۱۶

بھلا کہیں ایسا ہوسکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اس وقت ہم پھر زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں ؟

اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝۱۷

اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آبا و اجداد بھی اٹھائے جائیں گے ؟

قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دٰخِرُوْنَ ۝۱۸

ان سے کہو ہاں اور تم (خدا کے مقابلے میں) بےبس [۱۱] ہو ۔

(۱۱) ۔ یعنی اللہ جو کچھ بھی تمہیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ جب اس نے چاہا اس کے ایک اشارے پر تم وجود میں آگئے۔ جب وہ چاہے گا اس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے۔ اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمہیں اٹھا کھڑا کرے گا۔

فَاِنَّمَا ہِیَ زَجۡرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ فَاِذَا ہُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۹﴾
بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں گے [۱۲] ۔

(۱۲) ۔ یعنی جب یہ بات ہونے کا وقت آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کردینا کوئی بڑا لمبا چوڑا کام نہ ہوگا۔ بس ایک ہی جھڑکی سوتوں کو جگا اٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔ " جھڑکی " کا لفظ یہاں بہت معنیٰ خیز ہے، اس سے بعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوتے پڑے ہیں، یکایک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے " اٹھ جاؤ " اور بس آن کی آن میں وہ سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

وَ قَالُوۡا یٰوَیۡلَنَا ہٰذَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ ﴿۲۰﴾
اس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی، یہ تو یوم الجزا ہے۔

ہٰذَا یَوۡمُ الۡفَصۡلِ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۲۱﴾
یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے [۱۳]

(۱۳) ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات ان سے اہل ایمان کہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ فرشتوں کا قول ہو، ہوسکتا ہے کہ میدان حشر کا سارا ماحول اس وقت زبان حال سے یہ کہہ رہا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ خود انہی لوگوں کا دوسرا رد عمل ہو۔ یعنی اپنے دلوں میں وہ اپنے آپ ہی کو مخاطب کر کے کہیں کہ دنیا میں ساری عمر تم یہ سمجھتے رہے کہ کوئی فیصلے کا دن نہیں آنا ہے، اب آگئی تمہاری شامت، جس دن کو جھٹلاتے تھے وہی سامنے آگیا۔

اُحۡشُرُوا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا وَ اَزۡوَاجَہُمۡ وَ مَا کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲۲﴾
(حکم ہوگا) گھیر لاؤ سب ظالموں [۱۴] اور ان کے ساتھیوں [۱۵] اور ان معبودوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے [۱٦] ،

(۱۴) ۔ ظالم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنہوں نے دوسروں پر ظلم کیا ہو، بلکہ قرآن کی اصطلاح میں ہر وہ شخص ظالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بغاوت و سرکشی اور نافرمانی کی راہ اختیار کی ہو۔

(۱۵) ۔ اصل میں لفظ " ازواج " استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد ان کی وہ بیویاں بھی ہو سکتی ہیں جو اس بغاوت میں ان کی رفیق تھیں اور وہ

سب لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو انہی کی طرح باغی و سرکش اور نافرمان تھے۔ علاوہ بریں اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ایک قسم کے مجرم الگ الگ جتھوں کی شکل میں جمع کیے جائیں گے۔

(١٦) ۔ اس جگہ معبودوں سے مراد دو قسم کے معبود ہیں۔ ایک وہ انسان اور شیاطین جن کی اپنی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ لوگ خدا کو چھوڑ کر ان کی بندگی کریں۔ دوسرے وہ اصنام اور شجر و حجر وغیرہ جن کی پرستش دنیا میں کی جاتی رہی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کے معبود تو خود مجرمین میں شامل ہوں گے اور انہیں سزا کے طور پر جہنم کا راستہ دکھایا جائے گا۔ اور دوسری قسم کے معبود اپنے پرستاروں کے ساتھ اس لیے جہنم میں ڈالے جائیں گے کہ وہ انہیں دیکھ کر ہر وقت شرمندگی محسوس کریں اور اپنی حماقتوں کا ماتم کرتے رہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسری قسم کے معبود وہ بھی ہیں جنہیں دنیا میں پوجا تو گیا ہے مگر خود ان کا اپنا ایما ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی پرستش کی جائے، بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے منع کرتے رہے، مثلاً فرشتے، انبیا اور اولیاء۔ اس قسم کے معبود ظاہر ہے کہ ان معبودوں میں شامل نہ ہوں گے جنہیں اپنے پرستاروں کے ساتھ جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا۔

مِن دُونِ اللّٰهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ ﴿٢٣﴾
پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔

وَقِفُوهُمْ ۖ إِنَّهُم مَّسْئُولُونَ ﴿٢٤﴾
اور ذرا انھیں ٹھیراؤ، ان سے کچھ پوچھنا ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ ﴿٢٥﴾
کیا ہوگیا تمہیں، اب کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے ؟

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ ﴿٢٦﴾
ارے، آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں (١٧) ۔

(١٧) ۔ پہلا فقرہ مجرمین کو خطاب کر کے ارشاد ہوگا۔ اور دوسرا فقرہ ان عام حاضرین کی طرف رخ کر کے فرمایا جائے گا جو اس وقت جہنم کی روانگی کا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ فقرہ خود بتارہا ہے کہ اس وقت حالت کیا ہوگی۔ بڑے بڑے ہیکڑ مجرمین کے کس بل نکل چکے ہوں گے اور کسی مزاحمت کے بغیر وہ کان دبائے جہنم کی طرف جا رہے ہوں گے۔ کہیں کوئی ہز میجسٹی دھکے کھا رہے ہوں گے اور درباریوں میں سے کوئی " اعلیٰ حضرت " کو بچانے کے لیے آگے نہ بڑھے گا۔ کہیں کوئی فاتح عالم اور ڈکٹیٹر انتہائی ذلت کے ساتھ چلا جا رہا ہوگا اور اس کا لشکر جرار خود اسے سزا کے لیے پیش کر دے گا۔ کہیں کوئی پیر صاحب یا گرو جی یا مولی فادر واصل بجہنم ہو رہے ہوں گے اور مریدوں

میں سے کسی کو یہ فکر نہ ہوگی کہ حضرت والا کی توہین نہ ہونے پائے۔ کہیں کوئی لیڈر صاحب کسمپرسی کے عالم میں جہنم کی طرف رواں دواں ہوں گے اور دنیا میں جو لوگ ان کی کبریائی کے جھنڈے اٹھائے پھرتے تھے وہ سب وہاں ان کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں گے۔ یہ حد ہے کہ جو عاشق دنیا میں اپنے معشوق پر جان چھڑکتے تھے انہیں بھی اس کے حال بد کی کوئی پروا نہ ہوگی۔ اس حالت کا نقشہ کھینچ کر اللہ تعالیٰ دراصل یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ دنیا میں انسان اور انسان کے جو تعلقات اپنے رب سے بغاوت پر مبنی ہیں وہ کس طرح آخرت میں ٹوٹ کر رہ جائیں گے اور یہاں جو لوگ ہمچو ما دیگرے نیست کے غرور میں مبتلا ہیں، وہاں ان کا تکبر کس طرح خاک میں مل جائے گا۔

وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾

اس کے بعد یہ ایک دوسرے کی طرف مڑیں گے اور باہم تکرار شروع کردیں گے۔

قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾

(پیروی کرنے والے اپنے پیشواؤں سے) کہیں گے، "تم ہمارے پاس سیدھے رخ سے آتے تھے (۱۸)"۔

(۱۸) ۔ اصل الفاظ ہیں كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ۔ "تم ہمارے پاس یمین کی راس سے آتے تھے"۔ یمین کا لفظ عربی زبان میں متعدد مفہومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اگر اس کو قوت و طاقت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم کمزور تھے اور تم ہم پر غالب تھے، اس لیے تم اپنے زور سے ہم کو گمراہی کی طرف کھینچ لے گئے۔ اگر اس کو خیر اور بھلائی کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ تم نے خیر خواہ بن کر ہمیں دھوکا دیا۔ تم ہمیں یقین دلاتے رہے کہ جس راہ پر تم ہمیں چلا رہے ہو یہی حق اور بھلائی کی راہ ہے، اس لیے ہم تمہارے فریب میں آگئے۔ اور اگر اسے قسم کے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں اطمینان دلایا تھا کہ حق وہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو۔

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾

وہ جواب دیں گے، نہیں بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہ تھے۔

وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾

ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا، تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿۳۱﴾

آخرکار ہم اپنے رب کے اس فرمان کے مستحق ہوگئے کہ ہم عذاب کا مزا چکھنے والے ہیں۔

فَاَغْوَیۡنٰکُمْ اِنَّا کُنَّا غٰوِیۡنَ ۳۲
سو ہم نے تم کو بہکایا، ہم خود بہکے ہوئے تھے (۱۹) ۔

(۱۹) ۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورة سبا، حواشی نمبر 51، 52، 53۔

فَاِنَّہُمْ یَوْمَئِذٍ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوۡنَ ۳۳
اس طرح وہ سب اس روز عذاب میں مشترک ہوں گے (۲۰) ۔

(۲۰) ۔ یعنی پیرو بھی اور پیشوا بھی، گمراہ کرنے والے بھی اور گمراہ ہونے والے بھی، ایک ہی عذاب میں شریک ہوں گے۔ نہ پیروؤں کا یہ عذر مسموع ہوگا کہ وہ خود گمراہ نہیں ہوئے تھے بلکہ کیا گیا تھا، اور نہ پیشواؤں کی اس معذرت کو قبول کیا جائے گا کہ گمراہ ہونے والے خود ہی راہ راست کے طالب نہ تھے۔

اِنَّا کَذٰلِکَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیۡنَ ۳۴
ہم مجرموں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔

اِنَّہُمْ کَانُوۡۤا اِذَا قِیۡلَ لَہُمْ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ۙ یَسْتَکْبِرُوۡنَ ۳۵
یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا " اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے " تو یہ گھمنڈ میں آجاتے تھے

وَ یَقُوۡلُوۡنَ اَئِنَّا لَتَارِکُوۡۤا اٰلِہَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوۡنٍ ؕ ۳۶
اور کہتے تھے " کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں " ؟

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَ صَدَّقَ الْمُرْسَلِیۡنَ ۳۷
حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی (۲۱) ۔

(۲۱) ۔ رسولوں کی تصدیق کے تین معنی ہیں اور تینوں ہی یہاں مراد بھی ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے کسی سابق رسول کی مخالفت نہ کی تھی کہ اس رسول کے ماننے والوں کے لیے اس کے خلاف تعصب کی کوئی معقول وجہ ہوتی، بلکہ وہ خدا کے تمام پچھلے رسولوں کی تصدیق کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ کوئی نئی اور نرالی بات نہیں لایا تھا بلکہ وہی بات پیش کرتا تھا جو ابتدا سے خدا کے تمام رسول پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ ان تمام خبروں کا صحیح مصداق تھا جو پچھلے رسولوں نے اس کے بارے میں دی تھیں۔

اِنَّکُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِیۡمِ ۳۸

(اب ان سے کہا جائے گا کہ) تم لازماً درد ناک سزا کا مزا چکھنے والے ہو

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۳۹
اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے انہی اعمال کا دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۴۰
مگر اللہ کے چیدہ بندے (اس انجام بد سے) محفوظ ہوں گے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ۴۱
ان کے لیے جانا بوجھا رزق [۲۲] ہے،

(۲۲) یعنی ایسا رزق جس کی تمام خوبیاں بتائی جاچکی ہیں، جس کے ملنے کا انہیں یقین ہے، جس کے متعلق انہیں یہ بھی اطمینان ہے کہ وہ ہمیشہ ملتا رہے گا، جس کے بارے میں یہ خطرہ لگا ہوا نہیں ہے کہ کیا خبر، ملے یا نہ ملے۔

فَوَاكِهُ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ۴۲
ہر طرح کی لذیذ چیزیں [۲۳]،

(۲۳) اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جنت میں کھانا غذا کے طور پر نہیں بلکہ لذت کے لیے ہوگا۔ یعنی وہاں کھانا اس غرض کے لیے نہ ہوگا کہ جسم کے تحلیل شدہ اجزاء کی جگہ دوسرے اجزاء غذا کے ذریعہ فراہم کیے جائیں، کیونکہ اس ابدی زندگی میں سرے سے اجزائے جسم تحلیل ہی نہ ہوں گے، نہ آدمی کو بھوک لگے گی جو اس دنیا میں تحلیل کے عمل کی وجہ سے لگتی ہے اور نہ جسم اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے غذا مانگے گا۔ اسی بنا پر جنت کے ان کھانوں کے لیے " فواکہ " کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں تغذیہ کے بجائے تلذّذ کا پہلو نمایاں ہے۔

فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۴۳
اور نعمت بھری جنتیں جن میں وہ عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے۔

عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۴۴
تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۴۵
شراب [۲۴] کے چشموں [۲۵] سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں [۲۶] گے۔

(۲۴) ۔ اصل میں یہاں شراب کی تصریح نہیں ہے بلکہ صرف کأس (ساغر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن عربی زبان کی کأس کا لفظ بول کر ہمیشہ شراب ہی مراد لی جاتی ہے۔ جس پیالے میں شراب کے بجائے دودھ یا پانی ہو، یا جس پیالے میں کچھ نہ ہو اسے کأس نہیں کہتے۔ کأس کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب اس میں شراب ہو۔

(۲۵) ۔ یعنی وہ شراب اس قوم کی نہ ہوگی جو دنیا میں پھلوں اور غلوں کو سڑا کر کشید کی جاتی ہے۔ بلکہ وہ قدرتی طور پر چشموں سے نکلے گی اور نہروں کی شکل میں بہے گی۔ سورۃ محمد میں اسی مضمون کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۔ " اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لیے لذت ہوں گی "۔

(۲۶) ۔ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ شراب کے یہ ساغر لے کر جنتیوں کے درمیان گردش کون کرے گا۔ اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر ارشاد ہوئی ہے : وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ۔ " اور ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے ان کے خادم لڑکے، ایسے خوبصورت جیسے صدف میں چھپے ہوئے موتی " (الطور، آیت 24)۔ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۔ " اور ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہنے والے ہیں۔ تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی بکھیر دیے گئے ہیں " (الدہر، آیت 19)۔ پھر اس کی مزید تفصیل حضرت اَنَس اور حضرت سَمُرَہ بن جندُب کی ان روایات میں ملتی ہے جو انہوں نے نبی ﷺ سے نقل کی ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ " مشرکین کے بچے اہل جنت کے خادم ہوں گے " (ابو داؤد طَیالِسی، طبرانی، بزّار)۔ یہ روایات اگرچہ سنداً ضعیف ہیں، لیکن متعدد دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بچے سن رشد کو نہیں پہنچے ہیں وہ جنت میں جائیں گے۔ پھر یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن بچوں کے والدین جنتی ہوں گے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہیں گے تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اس کے بعد لامحالہ وہ بچے رہ جاتے ہیں جن کے ماں باپ جنتی نہ ہوں گے۔ سو ان کے متعلق یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ وہ اہل جنت کے خادم بنا دیے جائیں۔ (اس کے متعلق تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری اور عمدۃ القاری، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین رسائل و مسائل، جلد سوم، ص 177 تا 187)

بَيۡضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ ۚ ۝۴۶

چمکتی ہوئی شراب، جو پینے والوں کے لیے لذت ہوگی۔

لَا فِيۡهَا غَوۡلٌ وَّلَا هُمۡ عَنۡهَا يُنۡزَفُوۡنَ ۝۴۷

نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی۔ (۲۷)

(۲۷) ۔ یعنی وہ شراب ان دونوں قسم کی خرابیوں سے خالی ہوگی جو دنیا کی شراب میں ہوتی ہیں۔ دنیا کی شراب میں ایک قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کے قریب آتے ہی پہلے تو اس کی بدبو اور سڑاند ناک میں پہنچتی ہے، پھر اس کا مزا آدمی کے ذائقے کو تلخ کرتا ہے، پھر حلق سے اترتے ہی وہ پیٹ پکڑ لیتی ہے، پھر وہ دماغ کو چڑھتی ہے اور دوران سر لاحق ہوتا ہے، پھر وہ جگر کو متاثر کرتی ہے اور آدمی کی صحت پر اس کے برے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ پھر جب اس کا نشہ اترتا ہے تو آدمی خمار میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ یہ سب جسمانی ضرر ہیں۔ دوسری قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اسے پی کر آدمی بہکتا ہے، اول فول بکتا ہے اور عَرْبدہ کرتا ہے۔ یہ شراب کے عقلی نقصانات ہیں۔ دنیا میں انسان صرف سرور کی خاطر شراب کے یہ سارے نقصانات برداشت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت کی شراب میں سرور تو پوری طرح ہوگا (لذّۃ للشاربین) لیکن ان دونوں قسم کی خرابیوں میں سے کوئی خرابی بھی اس میں نہ ہوگی۔

وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۴۸ۙ

اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی (۲۸)، خوبصورت آنکھوں والی عورتیں (۲۹) ہوں گی،

(۲۸) ۔ یعنی اپنے شوہر کے سوا کسی اور کی طرف نگاہ نہ کرنے والی۔

(۲۹) ۔ بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں سن رشد کو پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کی بنا پر کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہل جنت کی خدمت کے لیے مقرر کردیے جائیں گے اور وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہل جنت کے لیے حوریں بنادی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نو خیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔ واللہ اعلم با لصواب۔

كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ۴۹

ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلی (۳۰)۔

(۳۰) ۔ اصل الفاظ ہیں كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ۔ "گویا وہ چھپے ہوئے یا محفوظ رکھے ہوئے انڈے ہیں" ان الفاظ کی مختلف تعبیرات اہل تفسیر نے بیان کی ہیں۔ مگر صحیح تفسیر وہی ہے جو حضرت ام سلمہؓ نے نبی ﷺ سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب حضور ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ان کی نرمی و نزاکت اس جھلی جیسی ہوگی جو انڈے کے چھلکے اور اس کے گودے کے درمیان ہوتی ہے (ابن جریر)۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُ□ُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ۵۰□
پھر و□ ایک دوسر□ کی طرف متوج□ □و کر حالات پوچھیں گ□□

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْ□ُمْ اِنِّ□ كَانَ لِ□ قَرِيْنٌ۵۱□
ان میں س□ ایک ک□□ گا، دنیا میں میرا ایک □م نشین تھا

يَّقُوْ□لُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ۵۲□
جو مجھ س□ ک□ا کرتا تھا، کی تم بھی تصدیق کرن□ والوں میں □و ؟ □ (۳۱) □

(۳۱) □ یعنی تم بھی ایس□ ضعیف الاعتقاد نکل□ ک□ زندگی بعد موت جیسی بعید از عقل بات کو مان بیٹھ□□

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظٰمًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ۵۳□
کیا واقعی جب □م مر چک□ □وں گ□ اور مٹی □وجائیں گ□ اور □ڈیوں کا پنجر بن کر ر□ جائیں گ□ تو □میں جزا و سزا د□ جائ□ گی ؟

قَالَ □لْ اَ□تُمْ مُّطَّلِعُوْنَ۵۴□
اب کیا آپ لوگ دیکھنا چا□ت□ □یں ک□ و□ صاحب اب ک□اں □یں ؟

فَاطَّلَعَ فَرَاٰ□ُ فِ□ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ۵۵□
ی□ ک□□ کر جوں □ی و□ جھک□ گا تو ج□نم کی گ□رائی میں اس کو دیکھ ل□ گا

قَالَ تَاللّٰ□ِ اِنْ كِ□تَّ لَتُرْدِيْنِ۵۶□
اور اس س□ خطاب کر ک□ ک□□ گا '' خدا کی قسم تو تو مجھ□ تبا□ □ی کردین□ والا تھا

وَلَوْلَا نِعْمَ□ُ رَبِّ□ لَكُ□تُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ۵۷□
میر□ رب کا فضل شامل حال ن□ □وتا تو آج میں بھی ان لوگوں میں س□ □وتا جو پکڑ□ □وئ□ آئ□ (۳۲) □یں□

(۳۲) □ اس س□ انداز□ □وتا □□ ک□ آخرت میں انسان کی سماعت اور بینائی اور گویائی کس پیمان□ کی □وگی□ جنت میں بیٹھا □وا ایک آدمی جب چا□تا □□ کسی ٹیلی ویژن ک□ آل□ ک□ بغیر بس یون□ی جھک کر ایک ایس□ شخص کو دیکھ لیتا □□ جو اس س□ ن□ معلوم کتن□ □زار میل ک□ فاصل□ پر ج□نم میں مبتلائ□ عذاب □□□ پھر ی□ی ن□یں ک□ و□ دونوں ایک دوسر□ کو دیکھت□ □یں، بلک□ ان ک□ درمیان کسی ٹیلی فون یا ریڈیو ک□ توسط ک□ بغیر براہ راست کلام بھی □وتا □□□ و□ اتن□ طویل فاصل□ س□ بات کرت□ □یں اور ایک دوسر□ کی بات سنت□ □یں□

اَفَمَا نَحۡنُ بِمَيِّتِيۡنَۙ ۵۸
اچھا تو کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں ؟

اِلَّا مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰى وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ ۵۹
موت جو ہمیں آنی تھی وہ بس پہلے آ چکی ؟ اب ہمیں کوئی عذاب نہیں ہونا ؟ (۳۳)

(۳۳) ۔ انداز کلام صاف بتارہا ہے کہ اپنے اس دوزخی یار سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ جنتی شخص اپنے آپ سے کلام کرنے لگتا ہے اور یہ تین فقرے اس کی زبان سے اس طرح ادا ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو ہر توقع اور ہر اندازے سے برتر حالت میں پا کر انتہائی حیرت واستعجاب اور وفور مسرت کے ساتھ آپ ہی آپ بول رہا ہو۔ اس طرح کے کلام میں کوئی خاص شخص مخاطب نہیں ہوتا اور نہ اس کلام میں جو سوالات آدمی کرتا ہے ان سے درحقیقت کوئی بات کسی سے پوچھنا مقصود ہوتا ہے، بلکہ اس میں آدمی کے اپنے ہی احساسات کا اظہار اس کی زبان سے ہونے لگتا ہے۔ وہ جنتی شخص اس دوزخی سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ محسوس کرتا ہے کہ میری خوش قسمتی مجھے کہاں لے آئی ہے۔ اب نہ موت ہے نہ عذاب ہے۔ ساری کلفتوں کا خاتمہ ہوچکا ہے اور مجھے حیات جاوداں نصیب ہوچکی ہے۔ اسی احساس کی بنا پر وہ بے ساختہ بول اٹھتا ہے کہ کیا اب ہم اس مرتبے کو پہنچ گئے ہیں ؟

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۶۰
یقینا یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

لِمِثۡلِ هٰذَا فَلۡيَعۡمَلِ الۡعٰمِلُوۡنَ ۶۱
ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔

اَذٰلِكَ خَيۡرٌ نُّزُلًا اَمۡ شَجَرَةُ الزَّقُّوۡمِ ۶۲
بولو، یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم (۳۴) کا درخت ؟

(۳۴) ۔ زَقّوم ایک قسم کا درخت ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزہ اس کا تلخ ہوتا ہے، بو ناگوار ہوتی ہے اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو ورم ہوجاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔

اِنَّا جَعَلۡنٰهَا فِتۡنَةً لِّلظّٰلِمِيۡنَ ۶۳
ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنادیا ہے (۳۵) ۔

(۳۵) ۔ یعنی منکرین یہ بات سن کر قرآن پر طعن اور نبی ﷺ پر استہزاء کا ایک نیا موقع پالیتے ہیں۔ وہ اس پر ٹھٹھا مار کر کہتے ہیں، لو اب نئی سنو، جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں درخت اگے گا۔

اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۶۴

وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔

طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۶۵

اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر (۳۶) ۔

(۳۶) ۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ شیطان کا سر کس نے دیکھا ہے جو زقوم کے شگوفوں کو اس سے تشبیہ دی گئی؟ دراصل یہ تخییلی نوعیت کی تشبیہ ہے اور عام طور پر زبان کے ادب میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم ایک عورت کی انتہائی خوبصورتی کا تصور دلانے کے لیے کہتے ہیں وہ پری ہے۔ اور انتہائی بدصورتی بیان کرنے کے لیے کہتے ہیں، وہ چڑیل ہے یا بھتنی ہے۔ کسی شخص کی نورانی شکل کی تعریف میں کہا جاتا ہے، وہ فرشتہ صورت ہے۔ اور کوئی نہایت بھیانک ہیئت کذائی میں سامنے آئے تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ وہ شیطان بنا چلا آ رہا ہے۔

فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔـوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۶۶

جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے ،

ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ۶۷

پھر اس پر پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی ملے گا

ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ۶۸

اور اس کے بعد ان کی واپسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی (۳۷) ۔

(۳۷) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل دوزخ جب بھوک پیاس سے بےتاب ہونے لگیں گے تو انہیں اس مقام کی طرف ہانک دیا جائے گا جہاں زقوم کے درخت اور کھولتے ہوئے پانی کے چشمے ہوں گے۔ پھر جب وہ وہاں سے کھا پی کر فارغ ہوجائیں گے تو انہیں دوزخ کی طرف لایا جائے گا۔

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ۶۹

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا

فَهُمْ عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ۷۰

اور انہی کے نقش قدم پر دوڑے چلے (۳۸) ۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَہُمْ اَکْثَرُ الْاَوَّلِیْنَ ۷۱ۙ
حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہوچکے تھے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِیْہِمْ مُّنْذِرِیْنَ ۷۲
اور ان میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔

فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُنْذَرِیْنَ ۷۳ۙ
اب دیکھ لو کہ ان تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا

اِلَّا عِبَادَ اللّٰہِ الْمُخْلَصِیْنَ ۷۴ؒ
اس بد انجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کرلیا ہے۔

وَ لَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ ﴿۷۵﴾

ہم کو (۳۹) (اس سے پہلے) نوحؑ نے پکارا تھا (۴۰)، تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔

(۳۹) ۔ اس مضمون کا تعلق پچھلے رکوع کے آخری فقروں سے ہے۔ ان پر غور کرنے سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ قصے یہاں کس غرض سے سنائے جا رہے ہیں۔

(۴۰) ۔ اس سے مراد وہ فریاد ہے جو حضرت نوحؑ نے مدتہائے دراز تک اپنی قوم کو دعوت دین حق دینے کے بعد آخر کار مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ سے کی تھی۔ اس فریاد کے الفاظ سورۃ قمر میں اس طرح آئے ہیں فَدَعَا رَبَّہٗ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ، " اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوگیا ہوں، اب تو میری مدد کو پہنچ " (آیت 10)

وَ نَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ﴿۷۶﴾

ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو کرب عظیم سے بچا لیا (۴۱)،

(۴۱) ۔ یعنی اس شدید اذیت سے جو ایک بد کردار اور ظالم قوم کی مسلسل مخالفت سے ان کو پہنچ رہی تھی۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ جس طرح نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس کرب عظیم سے بچایا گیا، اسی طرح آخر کار ہم محمد ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو بھی اس کرب عظیم سے بچا لیں گے جس میں اہل مکہ نے ان کو مبتلا کر رکھا ہے۔

وَ جَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ ﴿۷۷﴾

اور اسی نسل کو باقی رکھا (۴۲)،

(۴۲) ۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ حضرت نوح کی مخالفت کر رہے تھے ان کی نسل دنیا سے ناپید کردی گئی اور حضرت نوحؑ ہی کی نسل باقی رکھی گئی اور آگے صرف حضرت نوحؑ ہی کی اولاد سے دنیا آباد کی گئی۔ عام طور پر مفسرین نے اسی دوسرے معنی کو اختیار کیا ہے، مگر قرآن مجید کے الفاظ اس معنی میں صریح نہیں ہیں اور حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

وَ تَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۷۸﴾

اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔

سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۹﴾

سلام ہے نوحؑ پر تمام دنیا والوں میں (۴۳)۔

(۴۳) ؎ یعنی آج دنیا میں حضرت نوح ؑ کی برائی کرنے والا کوئی نیں ہے۔ طوفان نوح کے بعد سے آج تک ہزار ہا برس سے دنیا ان کا ذکر خیر کر رہی ہے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۸۰
ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۸۱
درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۸۲
پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کردیا۔

وَ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۸۳
اور نوحؑ ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۸۴
جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا (۴۴) ؎

(۴۴) ؎ رب کے حضور آنے سے مراد اس کی طرف رجوع کرنا اور سب سے منہ موڑ کر اسی کا رخ کرنا ہے۔ اور " قلب سلیم " کے معنی " صحیح سلامت دل " کے ہیں۔ یعنی ایسا دل جو تمام اعتقادی اور اخلاقی خرابیوں سے پاک ہو، جس میں کفر و شرک اور شکوک و شبہات کا شائبہ تک نہ ہو، جس میں نافرمانی اور سرکشی کا کوئی جذبہ نہ پایا جاتا ہو، جس میں کوئی ایچ پیچ اور الجھاؤ نہ ہو، جو ہر قسم کے برے میلانات اور ناپاک خواہشات سے بالکل صاف ہو، جس کے اندر کسی کے لیے بغض و حسد یا بد خواہی نہ پائی جاتی ہو، جس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۸۵
جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا (۴۵) ؎ یہ کیا چیزیں جن کے تم عبادت کر رہے ہو ؟

(۴۵) ؎ حضرت ابراہیم ؑ کے اس قصہ کی مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، الانعام، حواشی ۱۵ تا ۵۵، جلد سوم، مریم، حواشی ۲۶۔۲۷، الانبیاء، حواشی ۵۱ تا ٦٦، ا لشعراء، حواشی، ۵ تا ٦۴، العنکبوت، حواشی ۲۵ تا ۴۸۔

اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ۸۶

کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو ؟

فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٨٧
آخر اللہ رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے ؟ (۴۶)

(۴۶) ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو آخر تم نے کیا سمجھ رکھا ہے؟ کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ لکڑی پتھر کے معبود اس کے ہم جنس ہو سکتے ہیں ؟ یا اس کی صفات اور اس کے اختیارات میں شریک ہو سکتے ہیں ؟ اور کیا تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اس کے ساتھ اتنی بڑی گستاخی کر کے تم اس کی پکڑ سے بچے رہ جاؤ گے ؟

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِی النُّجُوْمِ ۝٨٨
پھر (۴۷) اس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی (۴۸)

(۴۷) ۔ اب ایک خاص واقعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کی تفصیلات سورۃ انبیاء (آیات 51 تا 73) اور سورۃ عنکبوت (آیات 16 تا 27) میں گزر چکی ہیں۔

(۴۸) ۔ ابن ابی حاتم نے مشہور تابعی مفسر قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اہل عرب نَظَرَ فِی النُّجُوْمِ (اس نے تاروں پر نگاہ ڈالی) کے الفاظ محاورہ کے طور پر اس معنی میں بولا کرتے ہیں کہ اس شخص نے غور کیا، یا وہ شخص سوچنے لگا۔ علامہ ابن کثیر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ویسے بھی یہ بات اکثر مشاہدہ میں آتی ہے کہ جب کسی شخص کے سامنے کوئی غور طلب معاملہ آتا ہے تو وہ آسمان کی طرف، یا اوپر کی جانب کچھ دیر دیکھتا رہتا ہے، پھر سوچ کر جواب دیتا ہے۔

فَقَالَ اِنِّیْ سَقِيْمٌ ۝٨٩
اور کہا میری طبیعت خراب ہے (۴۹)

(۴۹) ۔ یہ ان تین باتوں میں سے ایک ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زندگی میں یہ تین جھوٹ بولے تھے۔ حالانکہ اس بات کو جھوٹ، یا خلاف واقعہ کہنے کے لیے پہلے کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت حضرت ابراہیمؑ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی اور انہوں نے محض بہانے کے طور پر یہ بات بنادی تھی۔ اگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو خواہ مخواہ اسے جھوٹ آخر کس بنا پر قرار دے دیا جائے؟ اس مسئلے پر تفصیلی بحث ہم تفہیم القرآن جلد سوم (الانبیاء، حاشیہ ٦٠) میں کرچکے ہیں اور مزید بحث رسائل و مسائل، جلد دوم (صفحہ 35 تا 39) میں کی گئی ہے۔

فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ۹۰

چنانچہ وہ لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے (۵۰) ۔

(۵۰) ۔ یہ فقرہ خود بخود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ صورت معاملہ دراصل کیا تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے لوگ اپنے کسی میلے میں جا رہے ہوں گے۔ حضرت ابراہیم کے خاندان والوں نے ان سے بھی ساتھ چلنے کو کہا ہوگا۔ انہوں نے یہ کہہ کر معذرت کردی ہوگی کہ میری طبیعت خراب ہے، میں نہیں چل سکتا۔ اب اگر یہ بات بالکل ہی خلاف واقعہ ہوتی تو ضرور گھر کے لوگ ان سے کہتے کہ اچھے خاصے بھلے چنگے ہو، بلا وجہ بہانہ بنا رہے ہو۔ لیکن جب وہ عذر کو قبول کر کے انہیں پیچھے چھوڑ گئے تو اس سے خود ہی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ضرور اس وقت حضرت ابراہیم کو نزلے، کھانسی، یا کوئی اور ایسی ہی نمایاں تکلیف ہوگی جس کی وجہ سے گھر والے انہیں چھوڑ جانے پر راضی ہوگئے۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۹۱

ان کے پیچھے وہ چپکے سے ان کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا " آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں (۵۱) ؟

(۵۱) ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مندر میں بتوں کے سامنے طرح طرح کی کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی ہوں گی۔

مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۹۲

کیا ہوگیا، آپ لوگ بولتے بھی نہیں ؟ "

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ۹۳

اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔

فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ۹۴

(واپس آ کر) وہ لوگ بھاگے بھاگے اس کے پاس آئے (۵۲) ۔

(۵۲) ۔ یہاں قصہ مختصر کر کے بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ انبیاء میں اس کی جو تفصیل دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب انہوں نے آ کر اپنے مندر میں دیکھا کہ سارے بت ٹوٹے پڑے ہیں تو پوچھ گچھ شروع کی۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ ابراہیم نامی ایک نوجوان بت پرستی کے خلاف ایسی باتیں کرتا رہا ہے۔ اس پر مجمع نے کہا کہ پکڑ لاؤ اسے۔ چنانچہ ایک گروہ دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا اور انہیں مجمع کے سامنے لے آیا۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۹۵

اس نے کہا " کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو ؟

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۝۹۶
حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو" ۔

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِى الْجَحِيْمِ۝۹۷
" انھوں نے آپس میں کہا " اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو " ۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ۝۹۸
انھوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی، مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا (۵۳) ۔

(۵۳) ۔ سورۃ انبیاء (آیت 69) میں الفاظ یہ ہیں کہ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّ سَلَامًا عَلٰىٓ اِبْرٰهِيْمَ (ہم نے کہا، اے آگ ٹھنڈی ہوجا اور سلامتی بن جا ابراہیم کے لیے) اور سورۃ عنکبوت (آیت 24) میں ارشاد ہوا ہے فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ، (پھر اللہ نے اس کو آگ سے بچا لیا) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ابراہیم ؑ کو آگ میں پھینک دیا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس س بسلامت نکال دیا۔ آیت کے یہ الفاظ کہ " انہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے انہیں نیچا دکھا دیا " اس معنی میں نہیں لیے جاسکتے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم ؑ کو آگ میں پھینکنا چاہا تھا مگر نہ پھینک سکے۔ بلکہ مذکورہ بالا آیات کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے ان کا صاف مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگ میں پھینک کر انہیں ہلاک کردینا چاہتے تھے مگر نہ کرسکے اور ان کا معجزانہ طریقہ سے بچ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم کی برتری ثابت ہوگئی اور مشرکین کو اللہ نے نیچا دکھا دیا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے سے اصل مقصود قریش کے لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ جن ابراہیم کی اولاد ہونے پر تم فخر کرتے ہو ان کا طریقہ وہ نہ تھا جو تم نے اختیار کر رکھا ہے، بلکہ وہ تھا جسے محمد ﷺ پیش کر رہے ہیں۔ اب اگر تم ان کو نیچا دکھانے کے لیے وہ چالیں چلو گے جو حضرت ابراہیم کی قوم نے ان کے ساتھ چلی تھیں تو آخر کار نیچا تم ہی دیکھو گے، محمد ﷺ کو نیچا تم نہیں دکھا سکتے۔

وَقَالَ اِنِّىْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ۝۹۹
ابراہیم نے کہا (۵۴) " میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں (۵۵) ، وہی میری رہنمائی کرے گا۔

(۵۴) ۔ یعنی آگ سے بسلامت نکل آنے کے بعد جب حضرت ابراہیم ؑ نے ملک سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تو چلتے وقت یہ الفاظ کہے۔

(۵۵) ۔ اس کـــا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی خـــاطر نکـــل رہا ہوں کیونکہ اسی کا ہوجانے کی وجہ سے میری قـوم مـیری دشـمن ہوگـئی ہے ورنہ کوئی دنیوی جھگڑا مـیرے اور اس کے درمیـان نہ تھـا کہ اس کی بنـا پـر مجھے اپنـا وطن چھوڑنا پڑ رہا ہو۔ نیز یہ کہ میرا دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے جس کـا رخ کروں، تن بتقدیر بس اللہ کے بھروسـے پـر نکـل رہا ہوں، جـدھر وہ لے جـائے گـا اسی طرف چلا جاؤں گا۔

رَبِّ ہَبْ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ۝۱۰۰

اے پروردگار، مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔(۵٦) " ۔

(۵٦) ۔ اس دعـا سـے خـود بخـود یہ بـات معلـوم ہوتی ہے کہ حضـرت ابراہیم ؑ اس وقت بے اولاد تھے۔ قرآن مجیـد میں دوسـر مقامـات پـر جـو حـالات بیان کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف ایک بیـوی اور ایـک بھـتیجے (حضرت لوط علیہ السلام) کو لے کر ملک سـے نکلے تھے۔ اس وقت فطـرۃً آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ کوئی صالح اولاد عطا فرمائے جو اس غریب الوطنی کی حالت میں آپ کا غم غلط کرے۔

فَبَشَّرۡنٰہُ بِغُلٰمٍ حَلِیۡمٍ۝۱۰۱

(اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی)(۵۷) ۔

(۵۷)اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ دعا کرتے ہی یہ بشارت دے دی گئی۔ قـرآن مجید ہی میں ایک دوسرے مقام پر حضـرت ابـراہیم ؑ کـا یہ قـول نقل کیا گیا ہے کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ " شـکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمـائے۔" (سـورۃ ابـراہیم، آیت 39)۔ اس سے ثـابت ہوتـا ہے کہ سیدنا ابـرا ہیم کی دعـا اور اس بشـارت کے درمیـان سالہا سـال کـا فصـل تھا۔ بائیبـل کـا بیـان ہے کہ حضـرت اسـماعیل ؑ کی پیـدائش کے وقت حضـرت ابـرا یم کی عمـر 86 بـرس کی تھی (پیدائش 16:16) ، اور حضرت اسـحاق ؑ کی پیـدائش ک وقت سـو بـرس کی (۵ : ۲۱) ۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَہُ السَّعۡیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی ؕ قَـالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ۝۱۰۲

وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس سے کہا، " بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں (۵۸) ، اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے (۵۹) ؟ اس نے کہا، " ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے (٦۰) اسے کر ڈالیے، آپ انشاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے " ،

(۵۸) یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ابراہیم ؑ نے خواب میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ انہوں نے بیٹے کو ذبح کردیا ہے، بلکہ یہ دیکھا تھا کہ وہ اسے ذبح کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس وقت وہ خواب کا مطلب یہی سمجھے تھے کہ وہ صاحبزادے کو ذبح کردیں۔ اسی بنا پر وہ ٹھنڈے دل سے بیٹا قربان کردینے کے لیے بالکل تیار ہوگئے تھے۔ مگر خواب دکھانے میں جو باریک نکتہ اللہ تعالیٰ نے ملحوظ رکھا تھا اسے آگے کی آیت نمبر 105 میں اس نے خود کھول دیا ہے۔

(۵۹) صاحبزادے سے یہ بات پوچھنے کا مدعا یہ نہ تھا کہ تو راضی ہو تو خدا کے فرمان کی تعمیل کروں، بلکہ حضرت ابراہیم ؑ دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ جس صالح اولاد کی انہوں نے دعا مانگی تھی، وہ فی الواقع کس قدر صالح ہے۔ اگر وہ خود بھی اللہ کی خوشنودی پر جان قربان کردینے کے لیے تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دعا مکمل طور پر قبول ہوئی ہے اور بیٹا محض جسمانی حیثیت ہی سے ان کی اولاد نہیں ہے بلکہ اخلاقی و روحانی حیثیت سے بھی ان کا سپوت ہے۔

(۶۰) یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پیغمبر باپ کے خواب کو بیٹے نے محض خواب نہیں بلکہ خدا کا حکم سمجھا تھا۔ اب اگر یہ فی الواقع حکم نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ صراحۃً یا اشارۃً اس امر کی تصریح فرما دیتا کہ فرزند ابراہیم نے غلط فہمی سے اس کو حکم سمجھ لیا۔ لیکن پورا سیاق وسباق ایسے کسی اشارے سے خالی ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انبیاء کا خواب محض خواب نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بات سے ایک اتنا بڑا قاعدہ خدا کی شریعت میں شامل ہوسکتا ہو، وہ اگر مبنی بر حقیقت نہ ہوتی بلکہ محض ایک غلط فہمی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تردید نہ فرماتا۔ قرآن کو کلام الٰہی ماننے والے کے لیے یہ تسلیم کرنا محال ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی بھول چوک بھی صادر ہو سکتی ہے۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۱۰۳

آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کردیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا (۶۱)

(۶۱) یعنی حضرت ابراہیم ؑ نے ذبح کرنے کے لیے بیٹے کو چت لٹایا بلکہ اوندھے منہ لٹایا تاکہ ذبح کرتے وقت بیٹے کا چہرہ دیکھ کر کہیں محبت و شفقت ہاتھ میں لرزش پیدا نہ کر دے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ نیچے کی طرف سے ہاتھ ڈال کر چھری چلائیں۔

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۱۰۴

اور ہم نے ندا دی (۶۲) کہ ’’ اے ابراہیمؑ،

(٦٢) ۔ نحویوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں " اور " بمعنی " تو " ہے یعنی فقرہ یوں ہے کہ " جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کردیا اور ابراہیم ؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا تو ہم نے ندا دی "۔ لیکن ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں لفظ " جب " کا جواب محذوف ہے اور اس کو ذہن سامع پر چھوڑ دیا گیا ہے، کیونکہ بات اتنی بڑی تھی کہ اسے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے تصور ہی کے لیے چھوڑ دینا زیادہ مناسب تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا ہوگا کہ بوڑھا باپ اپنے ارمانوں سے مانگے ہوئے بیٹے کو محض ہماری خوشنودی پر قربان کردینے کے لیے تیار ہوگیا ہے اور بیٹا بھی گلے پر چھری چلوانے کے لیے راضی ہے، تو یہ منظر دیکھ کر کیسا کچھ دریائے رحمت نے جوش مارا ہوگا، اور مالک کو ان باپ بیٹوں پر کیسا کچھ پیار آیا ہوگا، اس کا بس تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ الفاظ میں اس کی کیفیت جتنی کچھ بھی بیان کی جائے گی وہ اس کو ادا نہیں کرے گی بلکہ اس کی اصلی شان سے کچھ گھٹ کر ہی ہوگی۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءۡيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيۡنَ ۱۰۵ۚ
تو نے خواب سچ کر دکھایا [٦٣] ۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں [٦٤] ۔

(٦٣) ۔ یعنی ہم نے تمہیں یہ تو نہیں دکھایا تھا کہ تم نے بیٹے کو ذبح کردیا ہے اور اس کی جان نکل گئی ہے، بلکہ یہ دکھایا تھا کہ تم ذبح کر رہے ہو۔ تو وہ خواب تم نے پورا کر دکھایا۔ اب ہمیں تمہارے بچے کی جان لینی مطلوب نہیں ہے۔ اصل مدعا جو کچھ تھا وہ تمہاری اس آمادگی اور تیاری سے حاصل ہوگیا ہے۔

(٦٤) ۔ یعنی جو لوگ احسان کی روش اختیار کرتے ہیں ان کے اوپر آزمائشیں ہم اس لیے نہیں ڈالا کرتے کہ انہیں خواہ مخواہ تکلیفوں میں ڈالیں اور رنج و غم میں مبتلا کریں۔ بلکہ یہ آزمائشیں ان کی فضیلتوں کو ابھارنے کے لیے اور انہیں بڑے مرتبے عطا کرنے کے لیے ان پر ڈالی جاتی ہیں، اور پھر آزمائش کی خاطر جس مخمصے میں ہم انہیں ڈالتے ہیں اس سے بخیریت ان کو نکلوا بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھو، بیٹے کی قربانی کے لیے تمہاری آمادگی و تیاری ہی بس اس کے لیے کافی ہوگئی کہ تمہیں وہ مرتبہ عطا کردیا جائے جو ہماری خوشنودی پر واقعی بیٹا قربان کردینے والے کو مل سکتا تھا۔ اس طرح ہم نے تمہارے بچے کی جان بچا دی اور تمہیں یہ مرتبہ بلند بھی عطا کردیا۔

اِنَّ ۔ذَا لَ وَ الْبَلٰٓـؤُا الْمُبِیۡنُ۱۰۶

یقینا ی۔ ایک کھلی آزمائش تھی " (٦٥) ۔

(٦٥) ۔ یعنی مقصود تم۔ار۔ ۔اتھ س۔ تم۔ار۔ بچ۔ کو ذبح کرا دینا ن۔ تھا، بلک۔ اصل مقصود تم۔ارا امتحان لینا تھا ک۔ تم ۔مار۔ مقابل۔ میں دنیا کی کسی چیز کو عزیز تر تو ن۔یں رکھت۔۔

وَ فَدَیۡن۔ُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ۱۰۷

اور ۔م ن۔ ایک بڑی قربانی فدی۔ میں د۔ کر اس بچ۔ کو چھڑا لیا (٦٦) ۔

(٦٦) ۔ "بڑی قربانی " س۔ مراد، جیسا ک۔ بائیبل اور اسلامی روایات میں بیان ۔وا ۔۔، ایک مینڈھا ۔۔ جو اس وقت الل۔ تعالیٰ ک۔ فرشت۔ ن۔ حضرت ابرا۔یم ۔ ک۔ سامن۔ پیش کیا، تاک۔ بیٹ۔ ک۔ بدل۔ اس کو ذبح کردیں۔ اس بڑی قربانی ک۔ لفظ س۔ اس لی۔ تعبیر کیا گیا ک۔ و۔ ابرا۔یم ۔ جیس۔ وفادار بند۔ ک لی۔ فرزند ابرا۔یم ۔ جیس۔ صابر و جاں نثار لڑک۔ کا فدی۔ تھا، اور اس۔ الل تعالیٰ ن۔ ایک ب۔نظیر قربانی کی نیت پوری کرن۔ کا وسیل۔ بنایا تھا۔ اس ک۔ علاو۔ اس۔ " بڑی قربانی " قرار دین۔ کی ایک وج۔ ی۔ بھی ۔۔ ک۔ قیامت تک ک۔ لی۔ الل۔ تعالیٰ ن۔ ی۔ سنت جاری کردی ک۔ اسی تاریخ کو تمام ا۔ل ایمان دنیا بھر میں جانور قربان کریں اور وفاداری و جاں نثاری ک۔ اس عظیم الشان واقع۔ کی یاد تاز۔ کرت۔ ر۔یں۔

وَ تَرَکۡنَا عَلَیۡ۔ِ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ۱۰۸۔۔

اور اس کی تعریف و توصیف ۔میش۔ ک۔ لی۔ بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔

سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبۡرٰ۔ِیۡمَ۱۰۹۔

سلام ۔۔ ابرا۔یم۔ پر

کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ۱۱۰۔

۔م نیکی کرن۔ والوں کو ایسی ۔ی جزا دیت۔ ۔یں۔

اِنَّ۔ٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ۱۱۱۔

یقینا و۔ ۔مار۔ مومن بندوں میں س۔ تھا۔

وَ بَشَّرۡنٰ۔ُ بِاِسۡحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ۱۱۲۔

اور ۔م ن۔ اس۔ اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں س۔۔

وَ بٰرَکۡنَا عَلَیۡ۔ِ وَ عَلٰۤی اِسۡحٰقَ ؕ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِ۔ِمَا مُحۡسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِ۔ٖ مُبِیۡنٌ۱۱۳۔٪

اور اسحاق کو برکت دی (٦٧) ۔ اب ان دونوں کی ذریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے (٦٨) ۔

(٦٧) ۔ یہاں پہنچ کر یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے جن صاحبزادے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے اور جنہوں نے اپنے آپ کو خود اس قربانی کے لیے پیش کردیا تھا، وہ کون تھے ۔ اب سے پہلے اس سوال کا جواب ہمارے سامنے بائیبل کی طرف سے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ :

" خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابرہام ـــــ تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا " ۔ (پیدائش، 221۔ 2)

اس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اکلوتے تھے۔ حالانکہ خود بائیبل ہی کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحاق اکلوتے نہ تھے۔ اس کے لیے ذرا بائیبل ہی کی حسب ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں :

" اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ اور ساری نے ابرام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے سو تو میری لونڈی کے پاس جا، شائد اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرام نے ساری کی بات مانی۔ اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے دس برس ہوگئے تھے جب اس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے۔ اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی " ۔ (پیدائش، 161۔ 3)

" خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام اسماعیل رکھنا " (1611)
" جب ابرام سے ہاجرہ کے اسماعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا " (1616)
اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے ـــــ اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا ـــــ تو اس کا نام اضحاق رکھنا ـــــ جو اگلے سال اسی وقت معین پر سارہ سے پیدا ہوگا ـــــــــ
تب ابرہام نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اور ـــــ گھر کے سب مردوں کو لیا اور اسی روز خدا کے حکم کے مطابق ان کا ختنہ کیا۔ ابرہام

ننانوے برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا اور جب اسماعیل کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا (پیدائش ۱۷ : ۱۵ : ۲۵))

اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا (پیدائش، ۵ : ۲۱)

اس سے بائیبل کی تضاد بیانی صاف کھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ 14 برس تک تنہا حضرت اسماعیل ہی حضرت ابراہیم ؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحاق کی نہیں بلکہ حضرت اسماعیل کی تھی، کیونکہ وہی اکلوتے تھے۔ اور اگر حضرت اسحاق کی قربانی مانگی گئی تھی تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

اس کے بعد ہم اسلامی روایات کو دیکھتے ہیں اور ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ مفسرین نے صحابہ وتابعین کی جو روایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے، اور اس گروہ میں حسب ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں :

حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عباس بن عبدالمطلب، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوہریرہ، قتادہ، عکرمہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، مجاہد، شعبی، مسروق، مکحول، زُہری، عطاء، مُقاتل، سدی، کعب احبار، زید بن اسلم ؒ وغیرہم

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیل تھے، اور اس گروہ میں حسب ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں :

حضرت ابوبکر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوہریرہ، حضرت معاویہ، عکرمہ، مجاہد، یوسف بن مہران، حسن بصری، محمد بن کعب القرظی، شعبی، سعید بن المسیّب، ضحاک، محمد بن علی بن حسین (محمد الباقر)، ربیع بن انس، احمد بن حنبل ؒ وغیرہم

ان دونوں فہرستوں کا تقابل کیا جائے تو متعدد نام ان میں مشترک نظر آئیں گے۔ یعنی ایک ہی بزرگ سے دو مختلف قول منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباس سے عکرمہ یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے۔ مگر انہی سے عطاء بن ابی رباح یہ بات نقل کرتے ہیں کہ زعمت الیہود انہ اسحٰق وکذبت الیہود (یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسحٰق تھے، مگر یہودی جھوٹ کہتے ہیں)۔ اسی طرح حضرت حسن بصری سے روایت یہ ہے کہ وہ حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کے قائل تھے۔ مگر عمرو بن عبید کہتے ہیں کہ حسن بصری کو اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیم ؑ کو جس بیٹے کو ذبیح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ اسماعیل ؑ تھے

اس اختلاف روایات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ علماء اسلام میں سے بعض پورے جزم و وثوق کے ساتھ حضرت اسحاق کے حق میں رائے دیتے ہیں، مثلاً ابن جریر اور قاضی عیاض۔ اور بعض قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیل تھے، مثلاً ابن کثیر۔ اور بعض مذبذب ہیں، مثلاً جلال الدین سیوطی۔ لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک و شبہ سے بالا تر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیل ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں :

۱۔ اوپر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیم نے ایک صالح بیٹے کے لیے دعا کی تھی اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک حلیم لڑکے کی بشارت دی۔ فحوائے کلام صاف بتارہا ہے کہ یہ دعا اس وقت کی گئی تھی جب آپ بےاولاد تھے۔ اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی وہ آپ کا پہلوٹا بچہ تھا۔ پھر یہ بھی قرآن ہی کے سلسلہ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ کے پہلوٹے صاحبزادے حضرت اسماعیل تھے نہ کہ حضرت اسحاق۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ (ابراہیم۔ آیت 39)

۲۔ قرآن مجید میں جہاں حضرت اسحاق کی بشارت دی گئی ہے وہاں ان کے لیے غلام علیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ فَبَشَّرُوْہُ بِغُلَامٍ عَلِیْمٍ (الذاریات۔ 28)۔ لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلَامٍ عَلِیْمٍ (الحجر۔ 53)۔ مگر یہاں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اس کے لیے غلام حلیم (بردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحبزادوں کی دو نمایاں صفات الگ الگ تھیں۔ اور ذبح کا حکم غلام علیم کے لیے نہیں بلکہ غلام حلیم کے لیے تھا۔

۳۔ قرآن مجید میں حضرت اسحاق کی پیدائش کی خوش خبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی دے دی گئی تھی کہ ان کے ہاں یعقوب ؑ جیسا بیٹا پیدا ہوگا فَبَشَّرْنَاهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ (ہود۔ 71) اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جاچکی ہو کہ اس کے ہاں ایک لائق لڑکا پیدا ہوگا، اس کے متعلق اگر حضرت ابراہیم کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اسے ذبح کر رہے ہیں، تو حضرت ابراہیم اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کردینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ علامہ ابن جریر اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیم کو اس

وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحاق کے ہاں حضرت یعقوب پیدا ہوچکے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس دلیل کا نہایت ہی بودا جواب ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ " جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوگیا " تب یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے سامنے آٹھ دس برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کرسکتا کہ جوان صاحب اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں گے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے کہ " ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے "۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی، پھر جب وہ باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا، پھر جب حضرت ابراہیم اس امتحان میں کامیاب ہوگئے تب ان کو ایک اور بیٹے اسحاق ؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیب واقعات قطعی طور پر فیصلہ کردیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحاق نہ تھے، بلکہ وہ ان سے کئی برس پہلے پیدا ہوچکے تھے۔ علامہ ابن جریر اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر رد کردیتے ہیں کہ پہلے صرف حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی، پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہوگئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ ان کے نبی ہونے کی خوشخبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں نہ فرماتا کہ " ہم نے اس کو اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے "۔ بلکہ یوں فرماتا کہ ہم نے اس کو یہ بشارت دی کہ تمہارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے۔

۵۔ معتبر روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اسماعیل ؑ کے فدیے میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا اس کے سینگ خانہ کعبہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجاج بن یوسف نے حرم میں ابن زبیر کا محاصرہ کیا اور خانہ کعبہ کو مسمار کردیا تو وہ سینگ بھی ضائع ہوگئے۔ ابن عباس اور عامر شعبی دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انہیں نے خود خانہ کعبہ میں یہ سینگ دیکھے ہیں (ابن کثیر)۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا یہ واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکہ مکرمہ میں پیش آیا تھا، اور حضرت اسماعیل کے ساتھ پیش آیا تھا، اسی لیے تو حضرت

ابراہیم و اسماعیل کے تعمیر کردہ خانۂ کعبہ میں اس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

٦۔ یہ بات صدیوں سے عرب کی روایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ منیٰ میں پیش آیا تھا۔ اور یہ صرف روایت ہی نہ تھی بلکہ اس وقت سے نبی ﷺ کے زمانے تک مناسک حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آ رہا تھا کہ اسی مقام منیٰ میں جا کر لوگ اسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیم ؑ نے قربانی کی تھی، جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی ﷺ مبعوث ہوئے تو آپ نے بھی اس طریقہ کو جاری رکھا، حتیٰ کہ آج تک حج کے موقع پر دس ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار برس کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیل ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحاق۔ حضرت اسحاق کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی ہے جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اسے حضرت ابراہیم کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابل تعجب نظر آتی ہے کہ خود امت مسلمہ میں حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کا خیال آخر پھیل کیسے گیا۔ یہودیوں نے اگر حضرت اسماعیل ؑ کو اس شرف سے محروم کر کے اپنے دادا حضرت اسحاق کی طرف اسے منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہ کثیر نے ان کی اس دھاندلی کو کیسے قبول کرلیا ؟ اس سوال کا بہت شافی جواب علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

" حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں) کعب احبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب جب حضرت عمر کے زمانے میں مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصاریٰ کی قدیم کتابوں کے مندرجات ان کو سنایا کرتے تھے اور حضرت عمر انہیں سن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے اور سب رطب و یابس جو وہ بیان کرتے تھے انہیں روایت کرنے لگے۔ حالانکہ اس امت کو ان کے اس ذخیرے معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی "۔

اس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قرظی کی ایک روایت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحاق تھے یا حضرت اسماعیل۔ اس وقت ایک ایسے صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علماء میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان ہوچکے تھے۔ انہوں نے کہا، "

امیرالمومنین، خدا کی قسم وہ اسماعیل ہی تھے، اور یہودی اس بات کو جانتے ہیں، مگر وہ عربوں سے حسد کی بنا پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسحاق تھے " (ابن جریر)۔ ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پروپیگنڈا کا اثر تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا، اور مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں، اس لیے ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو، جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالے سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے، محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کرلیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصب کار فرما ہے۔

(٦٨) ؎ یہ فقرہ اس پورے مقصد پر روشنی ڈالتا ہے جس کے لیے حضرت ابراہیم ؑ کی قربانی کا یہ قصہ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابرا یم کے دو بیٹوں کی نسل سے دو بہت بڑی قومیں پیدا ہوئیں۔ ایک بنی اسرائیل، جن کے گھر سے دنیا کے دو بڑے مذہب (یہودیت اور نصرانیت) نکلے اور انہوں نے روئے زمین کے بہت بڑے حصے کو حلقہ بگوش بنایا۔ دوسرے بنی اسماعیل جو نزول قرآن کے وقت تمام اہل عرب کے مقتدا و پیشوا تھے، اور اس وقت مکہ معظمہ کے قبیلہ قریش کو ان میں سب سے زیادہ اہم مقام حاصل تھا۔ نسل ابراہیمی کی ان دونوں شاخوں کو جو کچھ بھی عروج نصیب ہوا وہ حضرت ابراہیم اور ان کے ان دو عظیم المرتبت صاحبزادوں کے ساتھ انتساب کی بدولت ہوا، ورنہ دنیا میں نہ معلوم ایسے ایسے کتنے خاندان پیدا ہوئے ہیں اور گوشہ گمنامی میں جا پڑے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ اس خاندان کی تاریخ کا سب سے زیادہ زرین کارنامہ سنانے کے بعد ان دونوں گروہوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ تمہیں دنیا میں یہ جو کچھ شرف نصیب ہوا ہے وہ خدا پرستی اور اخلاص و فدویت کی ان شاندار روایات کی وجہ سے ہوا ہے جو تمہارے باپ دادا ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق (علیہم السلام) نے قائم کی تھیں۔ وہ انہیں بتاتا ہے کہ ہم نے ان کو جو برکت عطا فرمائی اور ان پر اپنے فضل و کرم کی جو بارشیں برسائیں، یہ کوئی اندھی بانٹ نہ تھی کہ بس یونہی ایک شخص اور اس کے دو لڑکوں کو چھانٹ کر نواز دیا گیا ہو، بلکہ انہوں نے اپنے مالک حقیقی کے ساتھ اپنی وفاداری کے کچھ ثبوت دیے تھے اور ان کی بنا پر وہ ان عنایات کے مستحق بنے تھے۔ اب تم لوگ محض اس فخر کی بنا پر کہ تم ان کی اولاد ہو، ان عنایات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ ہم تو یہ دیکھیں گے کہ تم میں سے محسن کون ہے اور ظالم کونہ پھر جو جیسا ہوگا، اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کریں گے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ ﴿۱۱۴﴾

اور ہم نے موسیٰ و ہارون پر احسان کیا،

وَ نَجَّیۡنٰہُمَا وَ قَوۡمَہُمَا مِنَ الۡکَرۡبِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۱۱۵﴾

ان کو اور ان کی قوم کو کرب عظیم سے نجات دی [٦٩] ،

(٦٩) ؎ یعنی اس شدید مصیبت سے جس میں وہ فرعون اور اس کی قوم کے ہاتھوں مبتلا تھے۔

وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَۚ۝۱۱۶
انھیں نصرت بخشی جس کی وجہ سے وہی غالب رہے ،

وَ اٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَۚ۝۱۱۷
ان کو نہایت واضح کتاب عطا کی،

وَ هَدَيْنٰهُمَا الصِّرٰطَ الْمُسْتَقِيْمَۚ۝۱۱۸
انھیں راہ راست دکھائی ،

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَۙ۝۱۱۹
اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا۔

سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ۝۱۲۰
سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۝۱۲۱
ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں ،

اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ۝۱۲۲
درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

وَ اِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَؕ۝۱۲۳
اور الیاس بھی یقینا مرسلین میں سے تھا (۷۰) ؎

(۷۰) ؎ حضرت الیاس ؑ انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے ان کا ذکر قرآن مجید میں صرف دو ہی مقامات پر آیا ہے۔ ایک یہ مقام اور دوسرا سورۃ انعام آیت 85۔ موجودہ زمانے کے محققین ان کا زمانہ 875 اور 850 قبل مسیح کے درمیان متعین کرتے ہیں۔ وہ جِلْعاد کے رہنے والے تھے (قدیم زمانے میں جِلْعاد اس علاقے کو کہتے تھے جو آج کل موجودہ ریاست اردن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے اور دریائے یرموک کے جنوب میں واقع ہے)۔ بائیبل میں ان کا ذکر ایلیاہ تشبی (Elijah the Tishbite) کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کے مختصر حالات حسب ذیل ہیں :

حضرت سلیمان ؑ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے رجُبْعام (Rehoboam) کی نااہلی کے باعث بنی اسرائیل کی سلطنت کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے۔ ایک حصہ جو بیت المقدس اور جنوبی فلسطین پر مشتمل تھا، آل داؤد کے قبضے میں رہا، اور

دوسرا حصہ جو شمالی فلسطین پر مشتمل تھا اس میں ایک مستقل ریاست اسرائیل کے نام سے قائم ہوگئی اور بعد میں سامریہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اگرچہ حالات دونوں ہی ریاستوں کے دگرگوں تھے، لیکن اسرائیل کی ریاست شروع ہی سے سخت بگاڑ کی راہ پر چل پڑی تھی جس کی بدولت اس میں شرک و بت پرستی، ظلم و ستم اور فسق و فجور کا زور بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب اسرائیل کے بادشاہ اخی اب (Ahab) نے صیدا (موجودہ لبنان) کے بادشاہ کی لڑکی ایزبل (Izabelle) سے شادی کرلی تو یہ فساد اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس مشرک شہزادی کے اثر میں آ کر اخی اب خود بھی مشرک ہوگیا، اس نے سامریہ میں بعل کا مندر اور مذبح تعمیر کیا، خدائے واحد کی پرستش کے بجائے بعل کی پرستش رائج کرنے کی بھر پور کوشش کی اور اسرائیل کے شہروں میں علانیہ بعل کے نام پر قربانیاں کی جانے لگیں۔

یہی زمانہ تھا جب حضرت الیاس ؑ یکایک منظر عام پر نمودار ہوئے اور انہوں نے جلعاد سے آ کر اخی اب کو نوٹس دیا کہ تیرے گناہوں کی پاداش میں اب اسرائیل کے ملک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسے گا، حتیٰ کہ اوس تک نہ پڑے گی۔ خدا کے نبی کا یہ قول حرف بحرف صحیح ثابت ہوا اور ساڑھے تین سال تک بارش بالکل بند رہی۔ آخر کار اخی اب کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے اور اس نے حضرت الیاس کو تلاش کرا کے بلوایا۔ انہوں نے بارش کے لیے دعا کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اسرائیل کے باشندوں کو اللہ رب العالمین اور بعل کا فرق اچھی طرح بتادیں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے حکم دیا کہ ایک مجمع عام میں بعل کے پوجاری بھی آ کر اپنے معبود کے نام پر قربانی کریں اور میں بھی اللہ رب العلمین کے نام پر قربانی کروں گا۔ دونوں میں سے جس کی قربانی بھی انسان کے ہاتھوں سے آگ لگائے بغیر غیبی آگ سے بھسم ہوجائے اس کے معبود کی سچائی ثابت ہوجائے گی۔ اخی اب نے یہ بات قبول کرلی۔ چناچہ کوہ کرمل (Carmel) پر بعل کے ساڑھے آٹھ سو پجاری جمع ہوئے اور اسرائیلیوں کے مجمع عام میں ان کا اور حضرت الیاس ؑ کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں بعل پرستوں نے شکست کھائی اور حضرت الیاس نے سب کے سامنے یہ ثابت کردیا کہ بعل ایک جھوٹا خدا ہے، اصل خدا وہی ایک اکیلا خدا ہے جس کے نبی کی حیثیت سے وہ مامور ہو کر آئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت الیاس نے اسی مجمع عام میں بعل کے پجاریوں کو قتل کرا دیا اور پھر بارش کے لیے دعا کی جو فوراً قبول ہوئی یہاں تک کہ پورا ملک اسرائیل سیراب ہوگیا۔

لیکن معجزات کو دیکھ کر بھی زن مرید اخی اب اپنی بت پرست بیوی کے شکنجے سے نہ نکلا۔ اس کی بیوی ایزبل حضرت الیاس کی دشمن ہوگئی اور اس نے قسم کھالی کہ جس طرح بعل کے پجاری قتل کیے گئے ہیں اسی طرح الیاس بھی قتل کیے جائیں گے۔ ان حالات میں حضرت الیاس کو ملک چھوڑنا پڑا اور چند سال تک وہ کوہ سینا کے دامن میں پناہ گزیں رہے۔ اس موقع پر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جو فریاد کی تھی اسے بائیبل ان الفاظ میں نقل کرتی ہے :

" بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا اور تیرے مذبحوں کو ڈھا دیا اور تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں "۔ (1۔ سلاطین ۱۹ : ۱۰)

اسی زمانے میں بیت المقدس کی یہودی ریاست کے فرمانروا یہورام (Jeh ram) نے اسرائیل کے بادشاہ اخی اب کی بیٹی سے شادی کرلی اور اس مشرک شہزادی کے اثر سے وہی تمام خرابیاں جو اسرائیل میں پھیلی ہوئی تھیں، یہودیہ کی ریاست میں بھی پھیلنے لگیں۔ حضرت الیاس نے یہاں بھی فریضۂ نبوت ادا کیا اور یہورام کو ایک خط لکھا جس کے یہ الفاظ بائیبل میں نقل ہوئے ہیں :

" خداوند تیرے باپ داؤد کا خدا یوں فرماتا ہے۔ اس لیے کہ تو نے اپنے باپ یہوسفط کی راہوں پر اور نہ یہوداہ کے بادشاہ آسا کی راہوں پر چلا بلکہ اسرائیل کے بادشاہوں کی راہ پر چلا ہے۔ اور یہوداہ اور یروشلم کے باشندوں کو زنا کار بنایا جیسا اخی اب کے خاندان نے کیا تھا اور اپنے باپ کے گھرانے میں سے اپنے بھائیوں کو جو تجھ سے اچھے تھے قتل بھی کیا، سو دیکھ خداوند تیرے لوگوں کو اور تیری بیویوں کو اور تیرے سارے مال کو بڑی آفتوں سے مارے گا اور تو انتڑیوں کے مرض سے سخت بیمار ہوجائے گا یہاں تک کہ تیری انتڑیاں اس مرض کے سبب سے روز بروز نکلتی چلی جائیں گی (2۔ تواریخ 2112۔ 15)

اس خط میں حضرت الیاس نے جو کچھ فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ پہلے یہورام کی ریاست بیرونی حملہ آوروں کی تاخت سے تباہ ہوئی اور اس کی بیویوں تک کو دشمن پکڑ لے گئے، پھر وہ خود انتڑیوں کے مرض سے ہلاک ہوا۔

چند سال کے بعد حضرت الیاس پھر اسرائیل تشریف لے گئے اور انہوں نے اخی اب کو، اور اس کے بعد اس کے بیٹے اخزیاہ کو راہ راست پر لانے کی مسلسل کوشش کی، مگر جو بدی سامریہ کے شاہی خاندان میں گھر کرچکی تھی وہ کسی طرح نہ نکلی۔ آخر کار حضرت کی بد دعا سے اخی اب کا گھرانا ختم ہوگیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دنیا سے اٹھا لیا۔ ان واقعات کی تفصیل کے لیے بائیبل کے حسب ذیل ابواب ملاحظہ ہوں۔ 1۔ سالطین، باب 17۔ 18۔ 19۔ 21۔ 2۔ سلاطین باب 1۔ 2۔ 3۔ تواریخ باب 21۔

اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۱۲۴

یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ’’ تم لوگ ڈرتے نہیں ہو ؟

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخٰلِقِيْنَۙ ۝۱۲۵

کیا تم بعل [۷۱] کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو،

(۷۱) ؎ بعل کے لغوی معنی آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوہر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا اور متعدد مقامات پر خود قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، مثلاً سورۃ بقرہ آیت 228۔ سورۃ نساء آیت 127۔ سورۃ ہود آیت 72، اور سورۃ نور آیت 31 میں۔ لیکن قدیم زمانہ کی سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنی میں استعمال کرتی تھیں اور انہوں نے ایک خاص دیوتا کو بعل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ لبنان کی فنیقی قوم (Phoenicians) کا سب سے بڑا نر دیوتا بعل تھا اور اس کی بیوی عستارات (Ashtoreth) ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا بعل سے مراد سورج ہے یا مشتری، اور عستارات سے مراد چاند ہے یا زہرہ۔ بہرحال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابل سے لے کر مصر تک پورے مشرق اوسط میں بعل پرستی پھیلی ہوئی تھی، اور خصوصاً لبنان، اور شام و فلسطین کی مشرک اقوام بری طرح اس میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد فلسطین اور مشرق اردن میں آ کر آباد ہوئے، اور توراۃ کے سخت امتناعی احکام کی خلاف ورزی کر کے انہوں نے ان مشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کردیے، تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے خلیف اور حضرت یوشع بن نون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں یہ اخلاقی و دینی زوال رو نما ہونا شروع ہوگیا تھا

" اور بنی اسرائیل نے خدا کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے ـــــــ اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے " (قضاۃ 2 11۔ 13)

" سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور حتّیوں اور اموریوں اور فِرِزّیوں اور یبوسیوں کے درمیان بس گئے اور بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو دینے اور ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے" (قضاۃ 25۔ 2)

اس زمانہ میں بعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گھس چکی تھی کہ بائیبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں علانیہ بعل کا مذبح بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیل اس حالت کو برداشت نہ کرسکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مذبح توڑ دیا۔ دوسرے روز ایک مجمع کثیر اکٹھا ہوگیا اور وہ اس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اڈے کو توڑا تھا (قضاۃ 625۔ 32)۔ اس صورت حال کو آخر کار حضرت سموایل، طالوت، داؤد اور سلیمان نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی بلکہ اپنی مملکت میں بالعموم شرک و بت پرستی کو دبا دیا۔ لیکن حضرت سلیمان کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر ابھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بعل پرستی کے سیلاب میں بہہ گئی۔

اللہَ رَبَّكُمْ وَ رَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ۝۱۲۶

اس اللہ کو جو تمہارا اور تمہارے اگلے پچھلے آبا و اجداد کا رب ہے ؟

فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾
مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا، سو اب یقینا وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں
،

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾
بجز ان بندگان خدا کے جن کو خالص کرلیا گیا تھا (۷۲) ۔

(۷۲) ۔ یعنی اس سزا سے صرف وہی لوگ مستثنیٰ ہوں گے جنہوں نے حضرت الیاس کو نہ جھٹلایا اور جن کو اللہ نے اس قوم میں سے اپنی بندگی کے لیے چھانٹ لیا ۔

وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾
اور الیاس کا ذکر خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا (۷۳) ۔

(۷۳) ۔ حضرت الیاس ؑ کو ان کی زندگی میں تو بنی اسرائیل نے جیسا کچھ ستایا اس کی داستان اوپر گزر چکی ہے، مگر بعد میں وہ ان کے ایسے گرویدہ و شیفتہ ہوئے کہ حضرت موسیٰ کے بعد کم ہی لوگوں کو انہوں نے ان سے بڑھ کر جلیل القدر مانا ہوگا ۔ ان کے ہاں مشہور ہوگیا کہ الیاس ؑ ایک بگولے میں آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے ہیں (2 سلاطین، باب دوم) اور یہ کہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے ۔ چنانچہ بائیبل کی کتاب ملاکی میں لکھا ہے :

" دیکھو، خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پہلے میں ایلیاہ نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا " (۴ : ۵)

حضرت یحیٰی اور عیسیٰ علیہما السلام کی بعثت کے زمانے میں یہودی بالعموم تین آنے والوں کے منتظر تھے ۔ ایک حضرت الیاس ۔ دوسرے مسیح ۔ تیسرے " وہ نبی " (یعنی آنحضرت ﷺ) ۔ جب حضرت یحیٰی کی نبوت شروع ہوئی اور انہوں نے لوگوں کو اصطباغ دنیا شروع کیا تو یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ان کے پاس جاکر پوچھا کیا تم مسیح ہو ؟ انہوں نے کہا نہیں ۔ پھر پوچھا کیا تم ایلیاہ ہو ؟ انہوں نے کہا نہیں ۔ پھر پوچھا کیا تم " وہ نبی " ہو ؟ انہوں نے کہا میں وہ بھی نہیں ہوں ۔ تب انہوں نے کہا اگر تم نہ مسیح ہو، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی، تو پھر تم بپتسمہ کیوں دیتے ہو ؟ (یوحنا 119 ۔ 26) ۔ پھر کچھ مدت بعد جب حضرت عیسیٰ ؑ کا غلغلہ بلند ہوا تو یہودیوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ شاید ایلیاہ نبی آگئے ہیں (مرقس 615 ۔ 15) خود حضرت عیسیٰ ؑ کے حواریوں میں بھی یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ ایلیاہ نبی آنے والے ہیں ۔ مگر حضرت نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ " ایلیاہ تو آ چکا، اور لوگوں نے اسے نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا ۔ " اس سے حواری خود جان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحییٰ

تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گزرے ہوئے حضرت الیاس (متی ۱۱ : ۱۴ اور متی ۱۷ : ۱۰ : ۱۳)۔

سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ۝۱۳۰
سلام ہے الیاس پر(۷۴)۔

(۷۴) اصل میں الفاظ ہیں سَلاَمٌ عَلیٰ اِلْ یَاسِیْن۔ اس کے متعلق بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حضرت الیاس کا دوسرا نام ہے، جس طرح حضرت ابراہیم کا دوسرا نام ابراہام تھا۔ اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے کہ اہل عرب میں عبرانی اسماء کے مختلف تلفظ رائج تھے، مثلاً میکال اور میکائیل اور میکائین ایک فرشتے کو کہا جاتا تھا۔ ایسا ہی معاملہ حضرت الیاس کے نام کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ خود قرآن مجید میں ایک ہی پہاڑ کا نام طور سینا بھی آیا ہے اور طور سینین بھی۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ۝۱۳۱
ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ۝۱۳۲
واقعی وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

وَ اِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝۱۳۳
اور لوط بھی انہی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

اِذْ نَجَّیۡنٰہُ وَ اَہۡلَہٗۤ اَجۡمَعِیۡنَ ۱۳۴ۙ
یاد کرو جب ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی،

اِلَّا عَجُوۡزًا فِی الۡغٰبِرِیۡنَ ۱۳۵
سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی (۷۵) ۔

(۷۵) ۔ اس سے مراد حضرت لوط کی بیوی ہے جو ہجرت کا حکم آنے پر اپنے شوہر نامدار کے ساتھ نہ گئی بلکہ اپنی قوم کے ساتھ رہی اور مبتلائے عذاب ہوئی۔

ثُمَّ دَمَّرۡنَا الۡاٰخَرِیۡنَ ۱۳۶
پھر باقی سب کو تہس نہس کردیا۔

وَ اِنَّکُمۡ لَتَمُرُّوۡنَ عَلَیۡہِمۡ مُّصۡبِحِیۡنَ ۱۳۷ۙ
آج تم شب و روز ان کے اجڑے دیار پر سے گزرتے ہو (۷۶) ۔

(۷۶) ۔ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ قریش کے تاجر شام و فلسطین کی طرف جاتے ہوئے شب و روز اس علاقے سے گزرتے تھے جہاں قوم لوط کی تباہ شدہ بستیاں واقع تھیں۔

وَ بِالَّیۡلِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۱۳۸٪
کیا تم کو عقل نہیں آتی ؟

وَ اِنَّ یُوۡنُسَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۱۳۹ؕ
اور یقینا یونس بھی رسولوں میں سے تھا (۷۷) ۔

(۷۷) ۔ یہ تیسرا موقع ہے جہاں حضرت یونس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اس سے پہلے سورۃ یونس اور سورۃ انبیاء میں ان کا ذکر گزر چکا ہے اور ہم اس کی تشریح کرچکے ہیں (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یونس، حواشی ۹۸ تا ۱۰۰، جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۸۲ تا ۸۵))

اِذۡ اَبَقَ اِلَی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ ۱۴۰ۙ
یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ (۷۸) نکلا،

(۷۸) ۔ اصل میں لفظ اَبَقَ استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں صرف اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ غلام اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ جائے۔ الاباق هرب العبد من سیدہ۔ " اِباق کے معنی ہیں غلام کا اپنے آقا سے فرار ہوجانا " (لسان العرب)

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ۱۴۱
پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا اور اس میں مات کھائی

فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ۱۴۲
آخرکار مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا (۷۹)

(۷۹) ان فقروں پر غور کرنے سے جو صورت واقعہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ :

۱۔ حضرت یونس جس کشتی میں سوار ہوئے تھے وہ اپنی گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی (Overloaded) تھی۔

۲۔ قرعہ اندازی کشتی میں ہوئی، اور غالباً اس وقت جب بحری سفر کے دوران میں یہ محسوس ہوا کہ بوجھ کی زیادتی کے سبب سے تمام مسافروں کی جان خطرے میں پڑگئی ہے۔ لہٰذا قرعہ اس غرض کے لیے ڈالا گیا کہ جس کا نام قرعے میں نکلے اسے پانی میں پھینک دیا جائے۔

۳۔ قرعے میں حضرت یونس ہی کا نام نکلا، وہ سمندر میں پھینک دیے گئے اور ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا۔

۴۔ اس ابتلا میں حضرت یونس اس لیے مبتلا ہوئے کہ وہ اپنے آقا (یعنی اللہ تعالیٰ) کی اجازت کے بغیر اپنے مقام ماموریت سے فرار ہوگئے تھے۔ اس معنی پر لفظ اَبَقَ بھی دلالت کرتا ہے جس کی تشریح اوپر 78 میں گزرچکی ہے، اور اسی معنی پر لفظ مُلِيْم بھی دلالت کرتا ہے۔ مُلیم ایسے قصور وار آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے قصور کی وجہ سے آپ ہی ملامت کا مستحق ہوگیا ہو، خواہ اسے ملامت کی جائے یا نہ کی جائے (یقال قد الام الرجل اذا اتیٰ ما یلام علیہ من الامر و ان لم یُلِم۔ ابن جریر)

فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ۱۴۳
اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا (۸۰)

(۸۰) اس کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس پہلے ہی خدا سے غافل لوگوں میں سے نہ تھے، بلکہ ان لوگوں میں سے تھے جو دائماً اللہ کی تسبیح کرنے والے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو انہوں نے اللہ ہی کی طرف رجوع کیا اور اس کی تسبیح کی۔ سورۃ انبیاء میں ارشاد ہوا ہے کہ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ پس ان تاریکیوں میں اس نے پکارا " نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات، بیشک میں قصور وار ہوں "

لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِہٖٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۱۴۴

تو روز قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا (۸۱) ۔

(۸۱) ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی اور حضرت یونس ؑ قیامت تک اس کے پیٹ میں زندہ رہتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک اس مچھلی کا پیٹ ہی حضرت یونس ؑ کی قبر بنا رہتا ۔ مشہور مفسر قتادہ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے (ابن جریر)۔

فَنَبَذْنٰہُ بِالْعَرَآءِ وَ ھُوَ سَقِیْمٌ ۱۴۵

آخرکار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک (۸۲) دیا ۔

(۸۲) ۔ یعنی جب حضرت یونس ؑ نے اپنے قصور کا اعتراف کرلیا اور وہ ایک بندہ مومن و قانت کی طرح اس کی تسبیح میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلی نے ان کو ساحل پر اگل دیا۔ ساحل ایک چٹیل میدان تھا جس میں کوئی روئیدگی نہ تھی، نہ کوئی ایسی چیز تھی جو حضرت یونس ؑ پر سایہ کرتی، نہ وہاں غذا کا کوئی سامان موجود تھا۔

اس مقام پر بہت سے عقلیت کے مدعی حضرات یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں جا کر کسی انسان کا زندہ نکل آنا غیر ممکن ہے۔ لیکن پچھلی ہی صدی کے اواخر میں اس نام نہاد عقلیت کے گڑھ (انگلستان) کے سواحل سے قریب ایک واقعہ پیش آ چکا ہے جو ان کے دعوے کی تردید کردیتا ہے۔ اگست 1891 ء میں ایک جہاز (Star of the East) پر کچھ مچھیرے وہیل کے شکار کے لیے گہرے سمندر میں گئے۔ وہاں انہوں نے ایک بہت بڑی مچھلی کو جو 20 فیٹ لمبی، 5 فیٹ چوڑی اور سو ٹن وزنی تھی، سخت زخمی کردیا۔ مگر اس سے جنگ کرتے ہوئے جیمز بارٹلے نامی ایک مچھیرے کو اس کے ساتھیوں کی آنکھوں کے سامنے مچھلی نے نگل لیا۔ دوسرے روز وہی مچھلی اس جہاز کے لوگوں کو مری ہوئی مل گئی۔ انہوں نے بمشکل اسے جہاز پر چڑھایا اور پھر طویل جدوجہد کے بعد جب اس کا پیٹ چاک کیا تو بارٹلے اس کے اندر سے زندہ برآمد ہوگیا۔ یہ شخص مچھلی کے پیٹ میں پورے 60 گھنٹے رہا تھا (اردو ڈائجسٹ، فروری 1964 ء)۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر معمولی حالات میں فطری طور پر ایسا ہونا ممکن ہے تو غیر معمولی حالات میں اللہ تعالیٰ کے معجزے کے طور پر ایسا ہونا کیوں غیر ممکن ہے ؟

وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَیْہِ شَجَرَۃً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ ۱۴۶

اور اس پر ایک بیلدار درخت (۸۳) اگا دیا ۔

(۸۳) ۔ اصل الفاظ ہیں شَجَرَۃً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ۔ یقطین عربی زبان میں ایسے درخت کو کہتے ہیں جو کسی تنے پر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ بیل کی شکل میں

پھیلتا ہے، جیسے، کدو، تربوز، ککڑی وغیرہ بہرحال وہاں کوئی ایسی بیل معجزانہ طریقہ پر پیدا کردی گئی تھی جس کے پتے حضرت یونس پر سایہ بھی کریں اور جس کے پھل ان کے لیے بیک وقت غذا کا کام بھی دیں اور پانی کا کام بھی۔

وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۱۴۷

اس کے بعد ہم نے اسے ایک لاکھ، یا اس سے زائد لوگوں کی طرف (۸۴) بھیجا ،

(۸۳) ۔ " ایک لاکھ یا اس سے زائد " کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی تعداد میں شک تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ان کی بستی کو دیکھتا تو یہی اندازہ کرتا کہ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہی ہوگی، کم نہ ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ یہ وہی بستی تھی جس کو چھوڑ کر حضرت یونس بھاگے تھے۔ ان کے جانے کے بعد عذاب آتا دیکھ کر جو ایمان اس بستی کے لوگ لے آئے تھے اس کی حیثیت صرف توبہ کی تھی جسے قبول کر کے عذاب ان پر سے ٹال دیا گیا تھا۔ اب حضرت یونس ؑ دوبارہ ان کی طرف بھیجے گئے تاکہ وہ نبی پر ایمان لا کر باقاعدہ مسلمان ہوجائیں۔ اس مضمون کو سمجھنے کے لیے سورۃ یونس، آیت 98 نگاہ میں رہنی چاہیے۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۱۴۸

وہ ایمان لائے اور ہم نے ایک وقت خاص تک انھیں باقی رکھا (۸۵) ۔

(۸۵) ۔ حضرت یونس کے اس قصے کے متعلق سورۃ یونس اور سورۃ انبیاءکی تفسیریں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس پر بعض لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دوسرے مفسرین کے اقوال بھی نقل کردیے جائیں۔

مشہور مفسر قَتَادہ سورۃ یونس، آیت 98 کی تفسیر میں فرماتے ہیں " کوئی بستی ایسی نہیں گزری ہے جو کفر کرچکی ہو اور عذاب آجانے کے بعد ایمان لائی ہو اور پھر اسے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس سے صرف قوم یونس مستثنیٰ ہے۔ انہوں نے جب اپنے نبی کو تلاش کیا اور نہ پایا، اور محسوس کیا کہ عذاب قریب آگیا ہے تو اللہ نے ان کے دلوں میں توبہ ڈال دی " (ابن کثیر، جلد 2، ص 433)

اسی آیت کی تفسیر علامہ آلوسی لکھتے ہیں " اس قوم کا قصہ یہ ہے کہ یونس ؑ موصل کے علاقہ میں نینویٰ کے لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ یہ کافر و مشرک لوگ تھے۔ حضرت یونس نے ان کو اللہ وحدہ لا شریک پر ایمان لانے اور بتوں کی پرستش چھوڑ دینے کی دعوت دی۔ انہوں نے انکار کیا اور جھٹلایا۔ حضرت یونس نے ان کو خبر دی کہ تیسرے دن ان پر عذاب آجائے گا اور تیسرا دن آنے سے پہلے آدھی رات کو وہ بستی سے نکل گئے۔ پھر دن کے وقت جب عذاب اس قوم کے سروں پر پہنچ گیا ـــــ اور انہیں یقین ہوگیا کہ سب ہلاک ہوجائیں گے تو انہوں نے اپنے نبی کو تلاش کیا، مگر نہ پایا۔ آخر کار وہ سب اپنے

بال بچوں اور جانوروں کو لے کر صحرا میں نکل آئے اور ایمان و توبہ کا اظہار کیا ـــــ پس اللہ نے ان پر رحم کیا اور ان کی دعا قبول کرلی " (روح المعانی، جلد 11، ص 170)

سورة انبیا کی آیت 87 کی تشریح کرتے ہوئے علامہ آلوسی لکھتے ہیں " حضرت یونس کا اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکل جانا ہجرت کا فعل تھا، مگر انہیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا " (روح المعانی، ج 17، ص 77) پھر وہ حضرت یونس کی دعا کے فقرے اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْن کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں " یعنی میں قصور وار تھا کہ انبیاء کے طریقہ کے خلاف، حکم آنے سے پہلے، ہجرت کرنے میں جلدی کر بیٹھا۔ یہ حضرت یونس ؑ کی طرف سے اپنے گناہ کا اعتراف اور توبہ کا اظہار تھا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کی اس مصیبت کو دور فرما دے " (روح المعانی، ج 17، ص 78)

مولانا اشرف علی تھانوی کا حاشیہ اس آیت پر یہ ہے کہ " وہ اپنی قوم پر جبکہ وہ ایمان نہ لائی خفا ہو کر چل دیے اور قوم پر سے عذاب ٹل جانے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لیے ہمارے حکم کا انتظار نہ کیا " (بیان القرآن)

اسی آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانی حاشیہ میں فرماتے ہیں " قوم کی حرکات سے خفا ہو کر غصہ میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے، حکم الٰہی کا انتظار نہ کیا اور وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا ـــــ اِنِّی کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْن، اپنے خطا کا اعتراف کیا کہ بیشک میں نے جلدی کی تیرے حکم کا انتظار کیے بدون بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہو" ۔

سورة صافات کی آیات بالا کی تشریح میں امام رازی لکھتے ہیں " حضرت یونس کا تصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس قوم کو جس نے انہیں جھٹلایا تھا، ہلاک کرنے کا وعدہ فرمایا، یہ سمجھے کہ یہ عذاب لا محالہ نازل ہونے والا ہے، اس لیے انہوں نے صبر نہ کیا اور قوم کو دعوت دینے کا کام چھوڑ کر نکل گئے، حالانکہ ان پر واجب تھا کہ دعوت کا کام برابر جاری رکھتے، کیونکہ اس امر کا امکان باقی تھا کہ اللہ ان لوگوں کو ہلاک نہ کرے " (تفسیر کبیر، ج 7، ص 185)

علامہ آلوسی اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْن پر لکھتے ہیں " ابق کے اصل معنی آقا کے ہاں سے غلام کے فرار ہونے کے ہیں چونکہ حضرت یونس اپنے رب کے اذن کے بغیر اپنی قوم سے بھاگ نکلے تھے اس لیے اس لفظ کا اطلاق ان پر درست ہوا " ۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں " جب تیسرا دن ہوا تو حضرت یونس اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نکل گئے۔ اب جو ان کی قوم نے ان کو نہ پایا تو وہ اپنے بڑے اور چھوٹے اور جانوروں، سب کو لے کر نکلے، اور نزول عذاب ان سے قریب تھا، پس انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور زاری کی اور معافی مانگی اور اللہ نے انہیں معاف کردیا " (روح المعانی، جلد 23، ص 13)

مولانا شبیر احمد صاحب وَهُوَ مُلِیْم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں " الزام یہی تھا کہ خطائے اجتہادی سے حکم الٰہی کا انتظار کیے بغیر بستی سے نکل پڑے اور عذاب کے دن کی تعیین کردی " ۔

پھر سورۃ القلم کی آیت فاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ پر مولانا شبیر احمد صاحب کا حاشیہ یہ ہے " یعنی مچھلی کے پیٹ میں جانے والے پیغمبر (حضرت یونس ؑ کی طرح مکذبین کے معاملے میں تنگ دلی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کیجیے "۔ اور اسی آیت کے فقرے وَهُوَ مَكْظُوْم پر حاشیہ تحریر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں یعنی قوم کی طرف سے غصے میں بھرے ہوئے تھے ۔ جھنجھلا کر شتابی عذاب کی دعا، بلکہ پیشن کر بیٹھے " ۔

مفسرین کے ان بیانات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تین قصور تھے جن کی وجہ سے حضرت یونس پر عتاب ہوا۔ ایک یہ کہ انہوں نے عذاب کے دن کی خود ہی تعیین کردی حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی اعلان نہ ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ دن آنے سے پہلے ہجرت کر کے ملک سے نکل گئے، حالانکہ نبی کو اس وقت تک اپنی جگہ نہ چھوڑنی چاہیے جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ آجائے۔ تیسرے یہ کہ جب اس قوم پر سے عذاب ٹل گیا تو واپس نہ گئے۔

فَاسْتَفْتِہِمْ اَلِرَبِّکَ الْبَنَاتُ وَ لَہُمُ الْبَنُوْنَ۱۴۹ۙ

پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو (۸٦) ، کیا (ان کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے (۸۷) !

(۸٦) ۔ یہاں سے ایک دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔ پہلا مضمون آیت نمبر 11 سے شروع ہوا تھا جس میں کفار مکہ کے سامنے یہ سوال رکھا گیا تھا " ان سے پوچھو، کیا ان کا پیدا کرنا زیادہ مشکل کام ہے یا ان چیزوں کا جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں "۔ اب انہی کے سامنے یہ دوسرا سوال پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے سوال کا منشا کفار کو ان کی اس گمراہی پر متنبہ کرنا تھا کہ وہ زندگی بعد موت اور جزا و سزا کو غیر ممکن الوقوع سمجھتے تھے اور اس پر نبی ﷺ کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب یہ دوسرا سوال ان کی اس جہالت پر متنبہ کرنے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے تھے اور قیاسی گھوڑے دوڑا کر جس کا چاہتے تھے اللہ سے رشتہ جوڑ دیتے تھے۔

(۸۷) ۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں قریش، جُہَینہ، بنی سَلِمہ، خزاعہ، بن ملیح اور بعض دوسرے قبائل کا عقیدہ یہ تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ان کے اس جاہلانہ عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو النساء، آیت 117۔ النحل آیات 57۔58۔ بنی اسرائیل، آیت 40۔ الزخرف، آیات 16 تا 19۔ النجم، آیات 21 تا 27۔

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ۝۱۵۰
کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں ؟

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ۝۱۵۱
خوب سن رکھو، دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے ،

وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝۱۵۲
اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ۝۱۵۳
کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کرلیں ؟

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ۝۱۵۴
تمہیں کیا ہوگیا ہے، کیسے حکم لگا رہے ہو

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۝۱۵۵
کیا تمہیں ہوش نہیں آتا

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ۝۱۵۶
یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے ،

فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۱۵۷
تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو (۸۸)

(۸۸) یعنی ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے کے لیے دو ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو ایسی بات مشاہدہ کی بنا پر کہی جاسکتی ہے، یا پھر اس طرح کا دعویٰ کرنے والے کے پاس کوئی کتاب الٰہی ہونی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ نے خود یہ فرمایا ہو کہ ملائکہ میری بیٹیاں ہیں۔ اب اگر اس عقیدے کے قائلین نہ مشاہدہ کا دعویٰ کرسکتے ہیں، اور نہ کوئی کتاب الٰہی ایسی رکھتے ہیں جس میں یہ بات کہی گئی ہو، تو اس سے بڑی جہالت و حماقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ محض ہوائی باتوں پر ایک دینی عقیدہ قائم کرلیا جائے اور خداوند عالم کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو صریحاً مضحکہ انگیز ہیں۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ۝۱۵۸
انھیں نے اللہ اور ملائکہ (۸۹) کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ ملائکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ مجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں

(۸۹) اصل میں ملائکہ کے بجائے الجنہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن بعض اکابر مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں جِنّ کا لفظ اپنے لغوی مفہوم (پوشیدہ مخلوق) کے لحاظ سے ملائکہ کے لیے ہی استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ ملائکہ بھی اصلاً ایک پوشیدہ مخلوق ہی ہیں۔ اور بعد کا مضمون اسی بات کا تقا ضا کرتا ہے کہ یہاں الجِنہ کے لفظ کو ملائکہ کے معنی میں لیا جائے۔

سُبْحٰنَ اللہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ۱۵۹
(اور وہ کہتے ہیں کہ) اللہ ان صفات سے پاک ہے

اِلَّا عِبَادَ اللہِ الْمُخْلَصِیْنَ ۱۶۰
جو اس کے خالص بندوں کے سوا دوسرے لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں

فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۱۶۱
پس تم اور تمہارے یہ معبود

مَآ اَنْتُمْ عَلَیْهِ بِفٰتِنِیْنَ ۱۶۲
اللہ سے کسی کو پھیر نہیں سکتے

اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِیْمِ ۱۶۳
مگر صرف اس کو جو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھلسنے والا ہو (۹۰)

(۹۰) اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے " پس تم اور تمہاری یہ عبادت، اس پر تم کسی کو فتنہ میں نہیں ڈال سکتے صرف اس کو جو " اس دوسرے ترجمہ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اے گمراہو، یہ جو تم ہماری پرستش کر رہے ہو اور ہمیں اللہ رب العالمین کی اولاد قرار دے رہے ہو، اس سے تم ہم کو فتنہ میں نہیں ڈال سکتے۔ اس سے تو کوئی ایسا احمق ہی فتنہ میں پڑ سکتا ہے جس کی شامت سر پر سوار ہو۔ دوسرے الفاظ میں گویا فرشتے اپنے ان پرستاروں سے کہتے رہے ہیں کہ " برو ایں دام بر مرغ وگرنہ۔"

وَ مَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۱۶۴
اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے، (۹۱)

(۹۱) یعنی اللہ کی اولاد ہونا تو درکنار، ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے جس کا جو درجہ اور مرتبہ مقرر ہے اس سے ذرہ برابر تجاوز تک کرنے کی مجال ہم نہیں رکھتے۔

وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۱۶۵

اور □م صف بستہ خدمت گار □یں

وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ۱۶۶
اور تسبیح کرنے والے □یں ۔

وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۱۶۷
یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے

لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۱۶۸
کہ کاش □مارے پاس وہ "ذکر" ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا

لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ۱۶۹
تو □م اللہ کے چیدہ بندے □وتے (۹۲) ۔

یہی مضمون سورۃ فاطر، آیت 42 میں گزر چکا ہے۔

فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۱۷۰
مگر (جب وہ آگیا) تو انھوں نے اس کا انکار کردیا۔ اب عنقریب انھیں (اس روش کا نتیجہ) معلوم □وجائے گا۔

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ ۱۷۱
اپنے بھیجے □وئے بندوں سے □م پہلے □ی وعدہ کرچکے □یں

اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۱۷۲
کہ یقینا ان کی مدد کی جائے گی

وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۱۷۳
اور □مارا لشکر □ی غالب □و کر رہے گا (۹۳) ۔

(۹۳) ۔ اللہ کے لشکر سے مراد وہ اہل ایمان □یں جو اللہ کے رسول کی پیروی کریں اور اس کا ساتھ دیں۔ نیز وہ غیبی طاقتیں بھی اس میں شامل □یں جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اہل حق کی مدد فرماتا ہے۔

اس امداد اور غلبے کے معنی لازماً یہی نہیں □یں کہ ہر زمانے میں اللہ کے ہر نبی اور اس کے پیروؤں کو سیاسی غلبہ □ی حاصل □و، بلکہ اس غلبے کی بہت سی صورتیں □یں جن میں سے ایک سیاسی غلبہ بھی ہے۔ جہاں اس نوعیت کا استیلاء اللہ کے نبیوں کو حاصل نہیں □وا ہے، وہاں بھی ان کا اخلاقی تفوق ثابت □و کر رہا ہے۔ جن قوموں نے ان کی بات نہیں مانی ہے اور ان کی دی □وئی ہدایات کے خلاف راستہ اختیار کیا ہے وہ آخر کار برباد □و کر رہی □یں جہالت

و ضالت کہ جو فلسفے بھی لوگوں نے گھڑے اور زندگی کے جو بگڑے ہوئے اطوار
بھی زبردستی رائج کیے گئے وہ سب کچھ مدت تک زور دکھانے کے بعد آخر کار
اپنی موت آپ مر گئے۔ مگر جن حقیقتوں کو ہزارہا برس سے اللہ کے نبی
حقیقت و صداقت کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں وہ پہلے بھی اٹل تھیں اور
آج بھی اٹل ہیں، انہیں اپنی جگہ سے کوئی ہلا نہیں سکا ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍۙ۱۷۴
پس اے نبیؐ ، ذرا کچھ مدت تک انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو

وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ۱۷۵
اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے (۹۴) ۔

(۹۴) ۔ یعنی کچھ زیادہ مدت نہ گزرنے پائے گی کہ اپنی شکست اور تمہاری
فتح کو یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہ بات جس طرح فرمائی
گئی تھی اسی طرح پوری ہوئی۔ ان آیات کے نزول پر بمشکل 14۔ 15 سال
گزرے تھے کہ کفار مکہ نے اپنی آنکھوں سے رسول ﷺ کا فاتحانہ داخلہ اپنے
شہر میں دیکھ لیا، اور پھر اس کے چند سال بعد انہی لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا
کہ اسلام نہ صرف عرب پر، بلکہ روم و ایران کی عظیم سلطنتوں پر بھی غالب
آگیا۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۱۷۶
کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں ؟

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ۱۷۷
جب وہ ان کے صحن میں آ اترے گا تو وہ دن ان لوگوں کے لیے بہت برا ہوگا
جنہیں متنبہ کیا جا چکا ہے۔

وَ تَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ۱۷۸
بس ذرا انھیں کچھ مدت کے لیے چھوڑ دو

وَّ اَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۱۷۹
اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود دیکھ لیں گے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۱۸۰
پاک ہے تیرا رب، عزت کا مالک، ان تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں

وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۱۸۱
اور سلام ہے مرسلین پر،

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۸۲

اور ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔ ع